۱۸۵۷ء کے غدار شعراء

اس کتاب میں سنہ ۱۸۵۷ء کے ان غدار شاعروں کے حالات
درج ہیں جنہوں نے جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کو ناکام کرنے، مجاہدین
کو نقصان پہنچانے یا شہید کرانے کے لئے انگریزوں سے ساز باز کی، یا
انگریزوں کے ساتھ مل کر آزادی کے مخالف پروگراموں کو کامیاب
کرانے کی کوشش کی یا کامیاب ہوئے۔

امداد صابری

پہلی بار — جولائی ۱۹۶۰ء
تعداد اشاعت — ایک ہزار
قیمت مجلد — دو روپے پچاس نئے پیسے
(یونین پریس ۔ دہلی)

فہرست مضامین

اس کتاب کو کسی انسان سے نہیں بلکہ سبق دینے والے وفادار جانور

مولابخش ہاتھی

کے نام سے معنون کرتا ہوں۔ یہ ہاتھی اپنے آقا بہادر شاہ ظفر کا اس قدر وفادار تھا کہ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے بعد اس نے دشمن یا کسی دوسرے کے ساتھ رہنا گوارا نہیں کیا اور اس کا حکم ماننا بھی پسند نہیں کیا۔ بلکہ بہادر شاہ کی فرقت میں بھوکوں مرا اور جان دیدی۔

اس کے برعکس اسی عہد و زمانہ میں انسانوں میں سے ایسے بھی غدار تھے جنہوں نے اپنے ذاتی مفاد کے خاطر مذہب و انسانیت کے دشمن، غیر ملکی حکمرانوں کی طاقت و اقتدار کو برقرار رکھنے اور ہندوستان کے طوق غلامی کو مضبوط کرنے، اور ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کو ناکام بنانے کے لئے اپنی پوری طاقت و قوت صرف کردی تھی اور مجاہدین کا مقابلہ کر کے ان کو پھانسیوں پر چڑھوا دیا تھا۔

مولابخش ہاتھی کی وفاداری اس بات کی مستحق نہیں تھی کہ ان حریص و طامع و غدار انسانوں کے ساتھ اس کا نام لیا جاتا۔ لیکن محض ان غداروں کے اعمال بد سے موازنہ کرنے کے لئے کہ ایک وفادار جانور کیسے کردار کا مالک ہے اور خود غرض انسانوں کے کیا کرتوت ہیں، اس کتاب میں اس کا نام لیا گیا۔ اور یہ

کتاب اس کے نام سے معنون کی گئی۔

کاش مولابخش ہاشمی کی وفادارانہ زندگی سے لوگ سبق حاصل کریں اور اپنے ذاتی مفاد کو ملک وقوم کے سامنے ہیچ سمجھیں تو یقیناً انسانیت ترقی کرے گی اور ملک وقوم بام عروج پر پہنچ جائے گی۔

امداد صابری

محلہ چوڑی والان۔ دہلی۔

مولا بخش ہاتھی

مولا بخش ایک قدیم و معمر ہاتھی تھا کئی بادشاہوں کو سواری دی تھی۔ اس ہاتھی کی عادتیں بالکل انسان کی سی تھیں۔ قد و قامت میں ایسا بلند و بالا تھا کہ ہندوستان کی سرزمین پر تھا اور نہ ہے۔ یہ ہاتھی بیٹھا ہوا اور ہاتھیوں کے قد کے برابر ہوتا تھا۔ خوبصورتی میں اپنا جواب نہیں رکھتا تھا۔ یہ دہلی کے کسی دروازہ سے نہیں نکل سکتا تھا۔ بہادر شاہ نے لاہوری دروازے کو مولا بخش ہی کے واسطے تڑوا کر بنوایا تھا تاکہ مع عماری کے گذر جائے۔ اور صرف لاہوری دروازے ہی کیوں توڑا گیا؟ وجہ یہ تھی کہ عید و بقرعید کی سواری عیدگاہ کے قریب ہونے سے اسی دروازے سے گذرتی تھی۔ لاہوری دروازے کے دو دروازے تھے۔

مولا بخش دوازدہ ماہ مست رہتا تھا۔ کسی آدمی کو سوائے خدمتی کے پاس نہ آنے دیتا تھا۔ جس دن بادشاہ سوار ہوتے تھے اس سے ایک دن پہلے بادشاہی چوبدار حکم سنا دیا کرتا تھا: میاں مولا بخش کل تمہاری نوکری ہے ہوشیار ہو جاؤ۔

نہادھو کر تیار رہو۔ بس اسی وقت سے یہ ہوشیار ہو جاتا تھا۔ فیل بان تھان سے کھول کر جمنا میں لے جاتا اور لیجا کر لٹا دیتا تھا اور جھانوے سے مَل مَل کر چھڑانا شروع کرتا۔ پاک صاف کر کے تھان پر لاتا نقاش مستک پر نقش و نگار کھینچتا۔ سواری کے وقت گدیلا کس کر کارخانہ میں لے جا کر گہنے پہنایا جاتا۔ جھول ڈالتا۔ عماری کسی نقارخانہ کی ڈیوڑھی پر لا کر استادہ کر دیتا تھا۔ جس وقت ہوادار سواری بادشاہ کی نقارخانہ کے دروازے سے باہر آتی تو چیخ مار کر تین سلام کرتا اور خود ہی بیٹھ جاتا تھا۔ جس وقت تک بادشاہ سوار نہیں ہو جاتے تھے اور خواص نہ بیٹھ جاتا جنبش کرنے کی مجال نہیں تھی۔ جب بادشاہ سوار ہو جاتے اور فوجدار اشارہ کرتا فوراً کھڑا ہو جاتا تھا۔ سواری کے وقت دو کمائیں اس کے دونوں کانوں میں پہنائی جاتی تھیں، دو ترکش تیروں کے کانوں کے نیچے آویزاں کئے جاتے تھے اور بہت بڑی فولادی خود مستک پر نصب کی جاتی تھی۔ اور بہت بڑا حقہ چاندی کا مع چلم، اس کے سر پر رکھا جاتا تھا اور پیچوان کی سٹک فوجدار خاں اپنے کندھے پر رکھتے تھے۔ بادشاہ ٹھنڈا حقہ پیتے جاتے تھے اور سواری چلی جاتی تھی۔ ایسا سبک رفتار چلتا تھا کہ چلم ذرہ برابر نہیں ہلتی تھی اور نہ ہی کبھی حقہ گرتا تھا۔ [1]

جامع مسجد کے مشرقی دروازے کے آگے جو سڑک ہے جس جگہ سے یہ سڑک قلعہ کے قریب مڑتی ہے اس موڑ پر فیل خانہ تھا۔ تمام دن گنوں کے لالچ میں مولا بخش ہاتھی کے ارد گرد بچے جمع رہتے تھے۔ کوئی بچہ کہتا تھا کہ مولا بخش یار چڑھی

[1] داستان غدر صہ ۲۴۔

ولوائی تو یہ سونڈ پر سے پاؤں کو ٹیڑھا کرکے اس لڑکے کو اپنے اوپر چڑھا لیتا تھا۔ جب لڑکے زیادہ ہوتے تھے اور کوئی لڑکا ان میں سے کہتا تھا کہ "مولا بخش یاری آوے" تو مولا بخش گنا چھیل کر سونڈ میں لے لیتا تھا اور تمام بچوں کی نظر سے بچا کر اسی لڑکے پر گنا پھینک دیتا تھا۔ مولا بخش کو جب چھ کنار روٹی دیتا تھا تو ہر نوالہ میں سے ایک کنارہ روٹی کا اپنی باچھ سے باہر نکال دیتا تھا جو لونڈا پاس کھڑا ہوتا تھا وہ دوڑ کر اس کے منہ سے نکلے ہوئے ٹکڑے کو پکڑ لیتا تھا۔ ہاتھی کی روٹی دو تین انچ موٹی ہوتی ہے۔ یہ بچہ اس کو زور لگا کر توڑتا اور مروڑتا تھا۔ مولا بخش سر ہلاتا گویا اپنی زبان میں انکار کرتا تھا۔ بمشکل تمام جب ٹکڑا اس بچہ کے ہاتھ آجاتا تھا اور بچہ وہ ٹکڑا لیکر بھاگ جاتا تھا اس وقت مولا بخش نوالہ کھاتا تھا۔ ہر نوالہ میں سے جب تک کوئی بچہ ٹکڑا نہیں لے لیتا تھا یہ روٹی نہیں کھاتا تھا۔ مولا بخش سے لڑکوں کی دوستی تھی جہاں کسی لڑکے نے مولا بخش سے کہا کہ مولا بخش "نکی آوے" تو مولا بخش اپنا ایک پاؤں اٹھا لیتا تھا اور جب یہی لڑکا جب "گھنٹے کی" کہتا تھا تو مولا بخش زمین پر پاؤں رکھتا تھا۔ نکی مانگنے کے بعد اگر فیل خانہ کا کوئی آدمی بچوں کو دھمکا کر بھگا دیتا تھا تو مولا بخش پاؤں اٹھائے رکھتا تھا۔ سید صاحب بہتیرا کہتے تھے کہ بیٹا وہ بچہ چلا گیا ہے پاؤں زمین پر رکھ دو، یہ اس کی ایک نہیں سنتا تھا۔ جب اس لڑکے کو سید صاحب بلا کر لاتے اور وہی لڑکا کہتا تھا کہ مولا بخش "گھنٹے کی" تو پاؤں زمین پر رکھتا تھا۔

مولا بخش جب اپنے گنے لاتا تھا اور بازار میں کوئی لڑکا کہتا کہ مولا بخش

نکی آوے تو مولا بخش قیں کر کے ایک پاؤں اٹھا لیتا تھا۔ چرکٹا کہتا تھا کہ بیٹا چل لیکن یہ ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھتا تھا۔ جب تک وہی لڑکا "گھنٹے کی" نہ کہے یہ ٹس سے مس نہیں ہوتا تھا۔

ایک روز فیل بان نے بادشاہ سے عرض کیا کہ حضور مولا بخش تمام گنے اور راتب کی روٹیاں بانٹ دیتا ہے بچوں کو روکا جائے۔ بہادر شاہ نے حکم دیدیا۔ صبح کو دستور کے مطابق مولا بخش نے بچوں کا انتظار کیا۔ جب کوئی لڑکا نہیں آیا تو مولا بخش نے گنّے نہیں کھائے شام کو راتب بھی نہیں کھایا اور نہ ہی پانی پیا۔ جب تیسرا روز گذر گیا تو فیل بان نے اس خیال سے کہ یہ مر جائے گا اور بغیر بچوں کے نہیں کھائے گا، بادشاہ کے پاس گیا اور کہا کہ مولا بخش نے تین روز سے کچھ نہیں کھایا ہے۔ یہ سنکر بادشاہ نے حکم دیا کہ بھائی میں بھی فقیر ہوں اور میرا ہاتھی بھی ایسا ہی ہے۔ خدا نے مجھ کو اس واسطے دیا ہے کہ ہم بانٹ کر کھائیں۔ جب بچے آنے شروع ہوئے تو مولا بخش نے راتب اور گنے بانٹ کر کھانے شروع کئے۔ [1]

ہاتھی کا بھی کینہ مشہور ہے۔ ہاتھی اور بھینسا دونوں انسان کے سخت دشمن ہیں۔ ایک سید صاحب نے مولا بخش ہاتھی کے ساتھ کسی قسم کا ناروا سلوک کیا تھا۔ مولا بخش بدلہ لینے کی تاک میں تھا موقع پاکر سید صاحب کو مولا بخش نے سونڈ میں لپیٹ کر ان کا ایک پاؤں اپنے پاؤں کے نیچے

---

[1] بہادر شاہ بادشاہ کا مولا بخش ہاتھی ص ۱۰۔

اور ایک ٹانگ سونڈ میں پکڑ کر چیر ڈالا۔ سید صاحب کی جیوہ کی گود میں ننھا سا بچہ دو ڈیڑھ برس کا تھا۔ خاوند کے غم میں روتی پیٹتی آئی اور اس بچہ کو اس کے آگے ڈال کر کہا کہ "بے موئے اس کو بھی مار ڈال"۔ مولابخش نے اس بچہ کو اپنی گردن پر سونڈ سے پکڑ کر بٹھا لیا۔ اس روز سے یہ بچہ جب تک مولابخش کے سامنے رہتا تھا، مولابخش سے جو وہ کہتا تھا وہ کرتا تھا۔ جب یہ بچہ مولابخش کی آنکھ سے اوجھل ہو جاتا تھا تو مولابخش دنگا کرنا شروع کر دیتا تھا۔ اس بچہ کا نام رحمت علی تھا۔ جب یہ بچہ بڑا ہوا تو اس کے ہم عمر بچے اس سے کھیلنے کو آتے تھے اور مولابخش بھی ان سے کھیلا کرتا تھا۔ اگر کوئی بچہ سید صاحب سے کہتا تھا کہ یار گنا نہیں کھلواتے تو سید صاحب مولابخش سے کہتے تھے کہ "مولابخش ہمارے یار کو یاری دو"۔ تو مولابخش گنا چھیل کر جس بچہ کو سید صاحب کہہ دیتے تھے اسی کو دے دیتا تھا۔

نواب احمد بخش خاں صاحب نے جو فیروز پور جھرکہ کے نواب تھے، ایک مکھنا ہاتھی جو بڑا قد آور تھا پالا تھا اور تیار کیا تھا کہ مولابخش سے اسے لڑوائیں گے۔ چنانچہ نواب صاحب نے بادشاہ کو ایک عرضی بھیجی کہ مولابخش سے میں اپنا مکھنا ہاتھی لڑواؤں گا۔ بادشاہ نے اس پر حکم لکھ دیا کہ تم میرے بچے ہو میں تم سے کیونکر ہاتھی لڑا سکتا ہوں۔ اگر مولابخش نے مار لیا تو مجھ کو رنج ہوگا اگر مکھنا نے مارا۔ تب بھی مجھے صدمہ ہوگا۔ ہاں اگر کوئی میرے برابر والا مجھ سے ہاتھی لڑوانے کی خواہش کرے گا تو میں لڑوا دوں گا۔ اس جواب سے نواب صاحب پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ بلکہ اپنے فیل بان کو

حکم دیا کہ جب مولا بخش نہانے کے لئے جمنا پر جائے تو مکھنا کو مولا بخش پر ہولدینا۔ ایک دن گرمی کا موسم دوپہر کے وقت چرکٹا مولا بخش کو نہلانے کے لئے جمنا پر لے گیا۔ مولا بخش کے نہانے کی خبر نواب صاحب کے ایک سپاہی نے جا کر دی کہ سرکار مولا بخش اس وقت نہا رہا ہے۔ نواب صاحب نے اسی وقت اپنے فیل بان کو حکم دیا کہ تم جلد جاؤ۔ چنانچہ جب یہ دریا کے قریب پہنچا تو مولا بخش کے چرکٹے نے آواز دی کہ میاں مکھنا کو ہٹا لو۔ لیکن یہ فیل بان نہیں مانا۔ مکھنا کو دریا میں ڈالدیا۔ مولا بخش کا موتھ دوسرے کنارے کی طرف تھا۔ مکھنا نے مولا بخش کے پیٹ پر ایک ٹکر ماری کہ مولا بخش آگے رل گیا۔ مکھنا نے دوسری ٹکر رسید کی۔ مولا بخش اس ٹکر میں فورا آڑے ہوا۔ تیسری ٹکر مکھنا مارنے بھی نہ پایا تھا کہ مولا بخش سامنے آگیا۔ ٹکروں کا سلسلہ شروع ہوا۔ مکھنا ذرا دبا اور پیچھے ہٹا اور مولا بخش باہر آیا۔ کنارہ پر آکر اس نے مکھنا کے ایک ایسی ٹکر ماری کہ دریا کا کنارہ گونج اٹھا۔ مکھنا بھاگا۔ آگے آگے مکھنا اور پیچھے پیچھے مولا بخش شہر کے اندر آگئے۔ بازار میں ہلڑ مچگیا۔ غرض مکھنا اپنے تھان میں آگیا۔ اب مولا بخش نے اس کو مارنا شروع کیا۔ تھوڑے عرصہ میں اس کا فیل بان آگیا اس نے اس کو ہٹانے کی کوشش کی لیکن یہ غصے میں کہاں سننے والے تھے۔ بادشاہ کو خبر پہنچی سوار ہو کر خود تشریف لائے اور مولا بخش کو آواز دی "بیٹا بس" یہ آواز سن کر مولا بخش تھان سے باہر آیا۔ بادشاہ نے اپنے ہاتھ پر رومال رکھ کر ہاتھ آگے بڑھایا۔ مولا بخش نے بادشاہ کے ہاتھ پر سونڈ رکھ دی۔ مولا بخش کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ بادشاہ اس کی سونڈ ہاتھ میں لئے ہوئے مولا بخش کے

کے تھان پر آئے اور اس کو باندھ دیا۔

بہادر شاہ نے ولی عہدی کے زمانہ میں ایک مکھنا ہاتھی پالا تھا جو نہایت بلند قامت اور خوب صورت تھا۔ بہادر شاہ نے حکم دیا کہ مولا بخش اب بڈھا ہو گیا ہے عماری موکھنا پر کسو۔ یہ خبر سنکر سید صاحب مولا بخش کے پاس آئے اور اس کے آگے بیٹھ کر اپنا سر پکڑ لیا اور کہا بیٹا مولا بخش آج سے ہم بھی بڈھے ہو گئے اور تو بھی بڈھا ہو گیا مکھنا پر حضور سوار ہوں گے۔ تھوڑی دیر تو مولا بخش نے انتظار کیا پھر جب دیکھا کہ سواری کا وقت گذر گیا ہے تو اس نے پاؤں کی زنجیر توڑ دی اور آہستہ آہستہ دیوان عام کی طرف چلا۔ جب مکھنا کے قریب آیا تو اس کے اوپر جو عماری کسی ہوئی تھی اس میں اس نے اپنی سونڈ ڈال دی اور مکھنا نے مولا بخش کو مارنا شروع کیا۔ مولا بخش مکھنا سے پٹتا رہا دونوں مہاوتوں نے ان کو علیحدہ کرنے کی کوشش کی لیکن یہ نہیں ہٹے۔ بہادر شاہ ظفر کو اطلاع ہوئی۔ جب یہ تشریف لائے اور مولا بخش سے کہا "بیٹا میں تجھ ہی پر سواری لوں گا" یہ سنکر مولا بخش نے مکھنا کو چھوڑ دیا اور اپنے فیل بان کے ہمراہ فیل خانہ میں آگیا۔ [1]

جب ۱۸۵۷ء کی دہلی کی جنگ آزادی میں بہادر شاہ ظفر کو شکست ہوئی اور گرفتار کر لئے گئے تو فیل خانۂ شاہی اور اصطبل پر بھی انگریزوں کا قبضہ ہو گیا تھا۔ اس وقت سے مولا بخش ہاتھی نے دانہ پانی چھوڑ دیا تھا۔ مولا بخش کے فیل بان نے جاکر سانڈرس صاحب کو اس بات کی اطلاع دی کہ ہاتھی نے

---

[1] بہادر شاہ بادشاہ کا مولا بخش ہاتھی صہ ۱۶

کھانا پینا چھوڑ دیا ہے۔ سانڈرس کو یقین نہیں آیا۔ فیلبان کو گالیاں دیں اور پانچ روپے کے لڈو اور کچوریاں ہمراہ لو اکر ہاتھی کے تھان پر پہنچا اور مولا بخش کے سامنے شیرینی کا ٹوکرا رکھوایا۔ ہاتھی نے جھلا کر ٹوکرا کھینچ کر مارا۔ تمام شیرینی گر گئی۔ سانڈرس بولا "ہاتھی باغی ہے اسے نیلام کر دو"۔ اسی روز صدر بازار میں لیجا کر نیلام کیا۔ بولی بولی گئی کوئی خریدار میسر نہیں ہوا۔ بنسی پنساری یک چشم جس کی دکان کھاری باؤلی میں تھی اس نے ڈھائی سو روپے بولی بولی۔ اسی بولی پر صاحب نے نیلام ختم کر دیا۔ فیل بان نے ہاتھی سے کہا کہ لے بھائی تمام عمر تو نے اور میں نے بادشاہوں کی نوکری کی اب میری اور تیری تقدیر پھوٹ گئی کہ ہلدی کی گرہ بیچنے والے کے دروازہ پر چلنا پڑا۔ یہ سنتے ہی ہاتھی کھڑے قد سے دھم سے زمین پر گر پڑا اور جان بحق ہو گیا۔[1]

"بہادر شاہ بادشاہ کا مولا بخش ہاتھی" کے مؤلف تحریر فرماتے ہیں کہ مولا بخش کے یہ واقعات جن شہزادوں نے خود اپنی آنکھ سے دیکھے تھے وہ میں نے لکھے ہیں۔

امداد صابری

چوڑی والان دہلی۔

[1] داستان غدر۔ ص ۲۶۔

سببِ تالیف

جب کہ کسی قوم پر پریشانی اور مصیبت آتی ہے تو عام طور پر لوگوں کی زبانوں پر یہ فقرہ ہوتا ہے کہ یہ قوم کی نا اتفاقی کا نتیجہ ہے اگر سب متحد ہو جائیں تو یہ مصیبت و پریشانی ختم ہو جائے گی۔ گویا قوم کی پریشانی کا علاج اس کا مکمل متحد ہو جانا ہے۔

یہ نظریہ قطعاً کسی صورت میں بھی درست نہیں بلکہ عمل و تجربہ اور مشاہدوں کی دنیا میں اس کا کوئی وجود نہیں ہے۔ دنیا میں کسی دور میں بھی انسانوں، قوموں، فرقوں بلکہ خاندانوں میں مکمل اتحاد نہیں ہوا۔

اور ہو بھی کیسے سکتا ہے جب کہ انسان کی شکل و صورت، قد و قامت، آنکھ ناک، ہاتھ پاؤں، عادات و اطوار، ذہن اور دماغی کیفیت و حالت مختلف ہیں اور ایک دوسرے سے میل اور جوڑ نہیں کھاتے۔ ایک باپ کے دو بیٹے ہیں ایک انتہائی متین اور سنجیدہ، بردبار اور نرم دل ہے، تعلیم کی طرف مائل

ہے، اچھے کاموں میں اس کا دل لگتا ہے، برے کاموں سے بیحد نفرت ہے، انتہائی خدا ترس ہی نہیں ہے بلکہ خدا کے بندوں کی خدمت کرتا ہے۔ دوسرا بالکل اس کی ضد ہے۔ ذرا ذرا سی بات پر بگڑتا ہے انتہائی موہنہ پھٹ، بدکلام، بددماغ، بدباطن ہے جہالت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے، علم سے کوئی تعلق نہیں ہے، آوارہ گردی اور بری صحبتوں میں اس کی طبیعت لگتی ہے، کوئی عیب ایسا نہیں جو اس میں نہ ہو دین داری، خدمت خلق چھوئی تک نہیں۔ خدا کے وجود کا منکر ہے۔ فرمائیے ہو سکتا ہے ان دونوں میں اتحاد۔ کتنا ہی متین و سنجیدہ اور بردبار کیوں نہ ہو کب تک بدزبانی و بداخلاقی برداشت کرے گا۔ کب تک صبر کرے گا، تحمل سے کام لے گا۔ ایک نہ ایک دن علیحدگی ضرور ہو گی تعلقات منقطع ہوں گے۔ رہا کہیں اتحاد باقی۔ گھر خراب ہو گا۔

جب مختلف طبائع ہیں تو ان کے عمل حرکات وسکنات و کردار بھی مختلف ہوں گے۔ جس کی وجہ سے صرف خانگی زندگی ہی تلخ و منتشر نہیں ہو گی بلکہ قومی و ملکی اور مذہبی معاملات میں بھی اختلاف و تلخی و انتشار پیدا ہونا لازمی امر ہے اور ٹکراؤ بھی یقینی ہے اور خاص طور پر زر، زن، زمین اور اقتدار و حکومت کے حصول کی کش مکش میں اتحاد ناممکن ہے، نفاق و نفرت ضرور پیدا ہو گی۔

حضرت آدم بذات خود غلطی کے مرتکب ہوئے۔ خدا کی نافرمانی کی۔ ان کو کچھ عرصہ بھی دنیا میں آئے ہوئے نہیں گذرا تھا کہ نفاق و فتنہ کا بیج بویا گیا۔ ہابیل و قابیل دونوں بھائیوں میں عورت کے حصول کے لئے اختلاف پیدا ہوا۔ ہابیل نے قابیل کو قتل کیا۔ دنیا کی ابتدائی تاریخ کو قطع نظر کرتے ہوئے

دیکھئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کو جب کہ پچانوے فی صدی سے زائد مسلمانوں میں اتحاد تھا، اخوت اسلامی شباب پر تھی جس کی نظیر دنیا کی کسی قوم میں نہیں ملتی۔ لیکن اس وقت بھی مسلمانوں میں منافقین کا طبقہ تھا، جو انتشار مچاتا رہتا تھا جن کے زہریلے اثرات درجہ بدرجہ حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کے دور اور عہد میں سرایت کرتے رہے۔ جس نے اپنا رنگ یہ دکھایا کہ وہ حضرات جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبتوں میں بیٹھتے تھے اور جو بے پناہ محبت حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تھی، اس کا مشاہدہ کئے ہوئے تھے، انہوں نے یزید کی طاقت و قوت سے متاثر ہو کر رسول خداؐ کے لخت جگر حضرت امام حسینؓ اور ان کے اکھتر نفوس کو اپنی ہوس اور خود غرضیوں کی قربان گاہ کی نذر کر دیا اور شہید کرنے تک سے باز نہیں آئے۔

اور اسی شرمناک ذہنیت کا نتیجہ تھا کہ نام نہاد خلیفہ ولید بن یزید بن عبدالملک نے ارادہ کیا تھا کہ کعبہ کی چھت پر بیٹھ کر شراب نوشی کرے[1]۔ اور یہ وہی ناپاک خصلت و عادت تھی کہ ۲۳۶ھ میں نام نہاد خلیفہ المتوکل علی اللہ جعفر نے حضرت امام حسین علیہ السلام کی قبر مبارک اور ان کے ارد گرد جتنی قبریں تھیں ان کو کھدوانے کا حکم دیا تھا اور وہاں کاشتکاری کرنے کا منصوبہ بنایا تھا جس کی وجہ سے عرصہ تک یہ مقام و جگہ خراب و خستہ حالت میں جنگل کی طرح پڑی رہی[2]۔

---

[1] تاریخ الخلفاء ص ۲۶۷۔ [2] تاریخ الخلفاء ص ۳۵۲۔

یہی وہ شقاوت تھی کہ خلیفہ ولید بن یزید بن عبدالملک کو خلیفہ یزید الناقص نے قتل کیا تھا تو مروان الحمار ابو عبدالملک بن محمد بن مروان بن حکم نے اپنے دور حکومت میں یزید الناقص کی قبر کھدوا کر ان کی نعش نکلوائی اور اس جرم میں کہ خلیفہ ولید کو اس نے قتل کیا تھا ان کی نعش کو سولی پر چڑھوایا[1]۔ کیا ایسے لوگوں کی ہمنوائی کوئی خود دار انسان کر سکتا ہے۔؟ ہرگز نہیں۔ تو مکمل اتحاد کہاں باقی رہا۔

جب محمود غزنوی نے نہر والے قلعہ کہنہ کو جو سومنات سے چالیس میل کے فاصلہ پر واقع ہے، فتح کر لیا اور اس کا راجہ پر دیو فرار ہو گیا تو اس وقت چاہیئے تو یہ تھا کہ کم از کم اس کی قوم کے یعنی ہندو عوام اور ہندو راجہ محمود غزنوی کی مخالفت کرتے۔ انہوں نے اس وقت مخالفت کرنے کے بجائے محمود غزنوی کے درباریوں کے ساتھ باشندگان سومنات کو یہ مشورہ دیا کہ دابشلیم مرتاض کو نہر والے کی حکومت سپرد کی جائے۔ چنانچہ دابشلیم مرتاض نے اس حکومت کو منظور ہی نہیں کیا بلکہ محمود سے کہا کہ فلاں دابشلیم جو میرا ہم قوم ہے اور میرا دشمن جانی ہے، جس وقت اس کو یہ معلوم ہو گا کہ مجھے اس علاقہ کی حکومت مل گئی ہے تو آپ کے جانے کے بعد مجھے کمزور سمجھ کر مجھ پر حملہ کرے گا اور مجھ پر غالب آجائے گا۔ بادشاہ کو چاہیئے کہ اس کو گرفتار کر لیں۔ جب محمود غزنوی نے اس کے علاقہ پر حملہ کر کے اس کو گرفتار کر لیا تو اس کو اس پر

---

[1] تاریخ الخلفا ص ۲۷۲۔

بھی صبر نہیں آیا بلکہ محمود غزنوی سے اصرار کیا۔ اور زور ڈال کر یہ کہا کہ ہمارے مذہب میں بادشاہ کو قتل کرنا جائز نہیں ہے بلکہ یہ قاعدہ ہے کہ جب ایک بادشاہ دوسرے بادشاہ کو مغلوب کرے تو اس کو گرفتار کیا جاتا ہے اور فاتح بادشاہ اپنے تخت کے نیچے ایک تنگ و تاریک گھر بنوا کر مغلوب و مفتوح بادشاہ کو اس میں قید کر دیتا ہے۔ اس کی دیوار میں ایک سوراخ کر دیا جاتا ہے اور اس سوراخ سے اس قیدی کو روٹی اور پانی پہنچایا جاتا ہے اور وہ اس وقت تک مقید رہتا ہے جب تک فاتح اور مفتوح دونوں میں سے ایک کا خاتمہ نہ ہو جائے۔ چونکہ میرے پاس کوئی ایسا قید خانہ نہیں اور نہ مجھ میں یہ طاقت ہے کہ دشمن کو اس طرح مقید رکھ کر اس کی حفاظت کر سکوں۔ آپ اگر اس کو اپنے ساتھ لے جائیں تو بہتر ہے۔ چنانچہ محمود غزنوی اس کو اپنے ہمراہ لے گئے [1]۔ کیا یہ خود غرضی مکمل اتحاد کا خاتمہ نہیں کرتی۔

حضرت امام ابوحنیفہؒ، حضرت امام حنبلؒ، حضرت شیخ احمد سرہندیؒ کو جیل خانوں میں بند کرنے اور ان کو قتل کرنے والے اور صادق دکنی اور جعفر بنگالی جیسے غدار ہر زمانہ میں نہیں ہوئے ہیں؟ ہوئے ہیں اور ہوں گے اور یہی باعث تفریق بنے ہیں۔

اس قسم کے ایک نہیں دو نہیں سینکڑوں نہیں ہزاروں نہیں، بلکہ دنیا کے لاتعداد واقعات ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ دنیا کا نظام ہمیشہ دو طبقوں کے ماتحت چلتا چلا آرہا ہے اور چلتا چلا جائے گا۔ ان طبقوں میں

---

[1] تاریخ فرشتہ اول ص۱۱۰۔

ایک طبقہ رحمانی، حسینی اور عوامی ہوتا ہے جو حق و صداقت کے لئے ظالموں سے نبرد آزما ہوتا ہے، حق بات کہتا ہے اور مظلوموں کا ہمنوا معاون و ساتھی ہوتا ہے، اور اس راستے میں ہر قسم کی مصیبتیں برداشت کر کے جان کی بازی لگا دیتا ہے جس کی تعداد بہت مختصر ہوتی ہے۔ دوسرا طبقہ شیطانی، یزیدی اور سرکاری ہوتا ہے جو کذب و افترا کا بانی، ظالم طاقتوں کا ہمنوا اور عوام کا دشمن ہوتا ہے۔ خوشامد کر کے اپنا الو سیدھا کرتا ہے اور قوم و ملک و ملت کے مفاد کو بڑی حقارت کے ساتھ ٹھکرا کر اپنے مفاد پر قربان کر دیتا ہے۔ ایسا طبقہ کثیر ہوتا ہے لیکن فتح حق والے طبقہ کو ہی ہوتی ہے۔

دنیا میں سب سے بڑا جرم حکومت کا تختہ پلٹنا ہے حکمراں کی بیخکنی کرنا ہے جس کو کوئی حکمراں برداشت کرنے کو تیار نہیں ہے۔ ہندوؤں کے شاستر اور خاص طور پر منوسمرتی میں برہمن کی بہت عزت کی جاتی ہے اور قانون میں ان کے لئے بڑی رعائتیں دی گئی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود موریہ خاندان سے قبل سکندر اعظم کے زمانہ میں عام طور پر برہمن سزائے موت یا سنگین سزا سے بالکل مستثنےٰ تھے۔ اس قاعدے سے صرف وہ برہمن مستثنےٰ تھے جن پر بادشاہ کی جانب سے بغاوت کا الزام نہ لگایا گیا ہو۔ جن برہمنوں پر بغاوت کا الزام ہوتا تھا وہ پانی میں غرق کر کے مار ڈالے جاتے تھے اور دوسری ذات کے لوگوں کو زندہ جلوا دیا جاتا تھا۔[1]

محمد شاہ تغلق کے عہد میں بڑے مجرموں کے لئے دارالخلافہ دولت آباد

---

[1] ارتھ شاستر۔

کا قلعہ دوگیر تھا۔ اس میں خطرناک غار بنے ہوئے تھے اور ان غاروں میں بڑے بڑے چوہے تھے جن سے بلی بھی ڈرتی تھی۔ چنانچہ ان غاروں کے بارے میں ملک خاں افغان نے ابن بطوطہ کو بتایا کہ وہ ایک دفعہ اس قلعہ کے ایک غار میں قید کیا گیا تھا جس کو چوہوں کا غار کہتے ہیں۔ رات کو وہ جمع ہو کر مجھ پر حملہ کرتے تھے اور میں تمام رات ان سے لڑتا رہتا تھا۔ ایک رات میں سو رہا تھا کسی نے خواب میں کہا کہ تو سورۂ اخلاص ایک لاکھ مرتبہ پڑھ لے خدائے تعالیٰ تجھ کو رہا کرا دے گا۔ میں نے سورۂ اخلاص تعداد کے مطابق ختم کی تو میں رہا ہو گیا تھا۔ میری رہائی کی وجہ یہ ہوئی کہ میرے برابر کے غار میں ملک مل باغی تھا۔ وہ بیمار ہو گیا تو چوہے اس کی انگلیاں اور آنکھیں کھا گئے۔ وہ مر گیا۔ بادشاہ کو جب یہ خبر پہنچی تو بادشاہ نے مجھ کو نکالنے کا حکم دیا کہ کہیں مجھے بھی چوہے نہ کھا جائیں۔ [۵]

اسی بادشاہ محمد تغلق نے امیر حلاجوں کی بغاوت کے سلسلہ میں لاہور کے باغیوں کی کھال کھچوائی تھی اور بعض کو دوسرے طریقوں سے قتل کیا گیا۔ یہ کام محمد بن نجیب نائب وزیر کے سپرد تھا۔ یہ شخص نہایت ظالم اور سنگدل تھا۔ بادشاہ اس کو بازاری شیر کہتا تھا۔ یہ اکثر مجرموں کو دانتوں سے کاٹتا تھا۔

سلطان محمد شاہ تغلق کا بھانجا بہاء الدین گشتاسپ بغاوت کے

---

[۵] ابن بطوطہ جلد دوم۔

سلسلے میں جب گرفتار ہوا اور بادشاہ کے سامنے لایا گیا تو حکم ہوا کہ اس کی زندہ کی کھال کھینچی جائے۔ چنانچہ کھال کھینچی گئی اور اس کا گوشت چاولوں میں پکوا کر اس کے گھر بھجوایا گیا اور ایک سینی میں رکھ کر ہتھنی کو دیا گیا جس نے اس کو نہیں کھایا۔ اس کے بعد اس کی کھال میں بھوسا بھروا کر تمام ملک میں پھروایا گیا۔ [1]

مذہبی اعتبار سے اللہ رب العزت کا سب سے بڑا مخالف اور اس کا باغی وہ شخص ہے جو کسی کو اس کا شریک ٹھیراتا ہے۔ اللہ رب العزت شرک کو برداشت نہیں کرتے مشرک کے لئے سخت سے سخت سزا تجویز کی گئی ہے۔

جس طرح حکمرانوں کے نزدیک ان کی مخالفت کرنے والا غدار قرار دیا جاتا ہے، اسی طرح ملک اور عوام کے نزدیک وہ لوگ بھی غدار سمجھے جاتے ہیں جو ملک و قوم کو اپنے مفاد کی خاطر تباہی کی طرف لیجائیں اور کسی غیر ملکی لوگوں یا حکمرانوں سے ملک کو غلام بنانے کا سودا کریں یا اس کی عزت و وقار کو نقصان پہنچائیں۔

اسی معیار و کسوٹی سے ہم نے "۱۸۵۷ء کے غدار شعراء" کو پرکھا ہے کہ جن شاعروں نے اس جنگ آزادی کو ناکام کرنے، مجاہدین کو نقصان پہنچانے یا شہید کرانے کے لئے انگریزوں سے سازباز کی یا انگریزوں کے ساتھ مل کر آزادی کے مخالف پروگراموں کو کامیاب کرنے کی کوشش کی

[1] ابن بطوطہ جلد دوم۔

اور کامیاب ہوئے اور اپنے ذاتی مفاد کو قوم کے مفاد پر مقدم سمجھا۔ اور اقتدار کی کرسی پر جمے رہے، ان کو ملک کا غدار ٹھیرایا ہے۔

جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کی تاریخوں میں مجاہدین و محبان وطن شعراء کے ساتھ غدار شاعروں کے واقعات بھی سامنے آئے۔ دل و دماغ نے فیصلہ کیا اور قلم بھی آمادہ ہوئی کہ اس طبقہ کو کیوں بخشا جائے۔ ان کے سیاہ اعمال بھی صفحۂ قرطاس پر آنے چاہئیں۔ چنانچہ سرسری مطالعہ کا نتیجہ ہے کہ ۱۶ غدار شاعروں کے حالات دستیاب ہوئے ہیں، جنہیں پیش کیا جا رہا ہے۔

"۱۸۵۷ء کے غدار شعراء" میں جن کتابوں سے مدد لی گئی ہے اور اخذ کیا گیا ہے وہ کتابیں حسب ذیل ہیں۔

(۱)	قیصر التواریخ	مؤلفہ	سید کمال الدین حیدر حسینی
(۲)	اخبار الصنادید	"	مولوی نجم الغنی رامپوری
(۳)	تذکرہ شعراء ہنود	"	منشی دیبی پرشاد بشاش
(۴)	خطبات عالیہ	"	مولوی انوار احمد زبیری
(۵)	تاریخ پٹیالہ	"	خلیفہ محمد حسین پٹیالوی
(۶)	تاریخ الخلفاء	"	علامہ جلال الدین سیوطیؒ
(۷)	ناصر الاخبار دہلی	ایڈیٹر	مولوی نصرت علی دہلوی
(۸)	بہارستان اودھ	مؤلفہ	مولوی عبداللہ عاشق
(۹)	دبدبۂ سکندری رامپور ـــ ۲ مارچ ۱۸۷۹ء		
(۱۰)	تاریخ نادر العصر	مؤلفہ	کرنل سانڈرس الگس ایبٹ

(۱۱) سخن شعراء مؤلفہ عبدالغفور نساخ

(۱۲) تاریخ فرشتہ

(۱۳) خم خانۂ جاوید " لالہ سری رام دہلوی

(۱۴) تاریخ رہیل کھنڈ " نواب نیاز احمد خاں

(۱۵) سفرنامہ ابن بطوطہ ابن بطوطہ

(۱۶) تذکرہ کاملانِ رامپور " حافظ احمد علی خاں شوق رامپوری

(۱۷) انتخاب یادگار " امیر مینائی

(۱۸) ارتھ شاستر

(۱۹) اودھ اخبار ـــ ۱۴ مئی ۱۸۷۶ء، مالک منشی نول کشور

(۲۰) داستان غدر مؤلفہ ظہیر دہلوی

(۲۱) تلامذۂ غالب " مالک رام

(۲۲) گلستانِ سخن " قادر بخش صابر دہلوی

(۲۳) سراپا سخن " سید محسن علی

(۲۴) تاریخ جرم و سزا " امداد صابری

(۲۵) مقدمہ بہادر شاہ ظفر " حسن نظامی دہلوی

(۲۶) گلدستۂ سخن " منشی نول کشور

(۲۷) بہادر شاہ بادشاہ اور مولا بخش ہاتھی۔ مؤلفہ منشی قربان علی دہلوی

(۲۸) صبح گلشن مؤلفہ سید علی حسن بھوپالی۔

ان کتابوں میں سے ہمیں تین کتابوں اخبار الصنادید، قیصر التواریخ، اور

خطبات عالیہ سے کافی مدد ملی ہے اور کافی مواد فراہم ہوا ہے۔ اخبار الصنادید کے مؤلف مولوی نجم الغنی صاحب رامپور کے نواب خاندانوں کے مداح تھے، ان کی ایماء پر یہ کتاب ۱۹۱۸ء میں طبع ہوئی تھی جب کہ گورنمنٹ برطانیہ ہند پر حکمرانی کر رہی تھی ۔

اس کتاب میں ۱۸۵۷ء کے دو غدار شاعر یوسف علی خاں والیٔ رامپور اور ان کے صاحبزادے نواب کلب علی خاں کے حالات زندگی درج ہیں۔ نواب یوسف علی خاں انگریزوں کے سب سے زیادہ وفادار تھے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے سخت دشمن تھے۔ رہیل کھنڈ کے علاقہ کے بڑے حصہ کو انہوں نے انگریزوں کے طوق غلامی کی زنجیروں میں جکڑوا دیا تھا اور مجاہدین کو بے رحمانہ اور بیدردانہ طریقوں سے قتل کرانے سے دریغ نہیں کیا تھا۔

اس کتاب کو طبع کرانے کا مقصد یہی تھا کہ نواب یوسف علی خاں نے جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کو ناکام کرانے کے لئے جو کارنامے انجام دیئے تھے ان کو تفصیل سے لکھا جائے ــــ اور انگریزوں کو بتایا اور جتایا جائے کہ نواب صاحب تمہارے بڑے بہی خواہ، وفادار اور سچے دوست تھے۔ چنانچہ اس کتاب میں بریلی، رامپور، نینی تال، بلند شہر اور مراد آباد کے پورے ضلع کے مقامات امروہہ، سنبھل، حسن پور، ٹھاکر دوارہ کی "خدمات جلیلہ" کا ذکر ہے کہ نواب صاحب اور ان کی فوج نے کس طرح ان مقامات پر مجاہدین کی حکومت کی مخالفت کی اور قبضہ ہونے کے بعد ان کو بیدخل کیا اور ان کے خون سے ہولی کھیلی ــــ اور اپنے آقا انگریزوں کی جانیں بچائیں ــــ

نواب صاحب اور ان کے صاحبزادے کے ان کارہائے نمایاں کا ذکر اس کتاب کے علاوہ کسی دوسری کتاب میں نہیں ملتا۔ اس لئے اسی کتاب سے ان کے واقعات اخذ کئے ہیں۔ ان کے حالات زندگی میں اس کتاب کا حوالہ ہر جگہ نہیں دیا گیا ہے بلکہ صفحات کے نمبر دیئے ہیں۔

قیصر التواریخ میں لکھنؤ کی ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے واقعات و حالات درج ہیں۔ واجد علی شاہ کی حکومت اور اس کی معزولی کا حال بھی ہے۔ یہ تاریخ ۱۸۹۶ء میں طبع ہوئی۔ اس کتاب کا چوتھائی حصہ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے علاوہ جنرل سلیمن رزیڈنٹ ۱۸۴۹ء کے زمانہ میں ہنری ایلیٹ صاحب سکریٹری حکومت ہند کے حکم سے مرتب ہوا تھا اور جس کی اصلاح کلنٹ صاحب مہتمم کالج اور جنرل مارٹن اور ڈاکٹر اسپرنچر صاحب نے کی تھی۔

اس کتاب کے مؤلف سید کمال الدین حیدر المعروف سید محمد زائر لکھنوی، جنرل کالیفلڈ رزیڈنٹ لکھنؤ کی سفارش سے عملہ رسد خانہ سلطانی پر مامور ہوئے تھے۔ جب یہ کتاب نواب واجد علی شاہ نے پڑھی تو بہت خفا ہوئے۔ بقول مؤلف۔ ؎[1]

" قطب الدولہ نے جب تواریخ مجھ سے منگوا بھیجی، بادشاہ نے حضرت جنت مکان کا احوال دیکھا بہت خوش ہوئے اور تعریف کی جب اپنے احوال پر آئے بعض مقامات جو حقیقت میں سچ تھے دیکھے اور برطرف کیا ہر چند میں نے واسطے یہ کہا کہ اگر

[1] قیصر التواریخ دوئم ص ۶۲۔

میں خود پڑھ کر ان مقامات کو سنتا اور خفا ہوتے جواب شافی دیتا۔
مگر مجھے نہ لے گئے۔ یہاں کچھ طمع نہ تھی کہ امیدوار ہوتا صبر کیا۔"

اس کتاب میں انگریزی حاکموں اور ان کے حامیوں کی تعریف اور واجد علی شاہ، برجیس قدر حضرت محل اور مجاہدوں کی مذمت اور تضحیک کی گئی ہے۔ شرف الدولہ نواب محمد ابراہیم خاں، خلیل کشمیری اور مرزا محمد تقی ہوس فیض آبادی کے ملک دشمن اور جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کی مخالفت کے واقعات اس کتاب میں درج ہیں اور خاص طور پر شرف الدولہ کے انگریزوں سے تعلقات اور سازباز، واجد علی شاہ اور ان کے ساتھیوں سے دشمنی، برجیس قدر حضرت محل اور حضرت احمد اللہ شاہ اور مجاہدین کو دھوکہ دینے والے واقعات اور جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کو نقصان پہنچانے اور ناکام کرنے کے کافی ثبوت ملتے ہیں جو کسی دوسری کتاب میں نہیں پائے جاتے ہیں۔ ان دونوں شاعروں کے تلامذہ حالات اسی کتاب سے لئے گئے ہیں۔ ان میں بھی کتاب کے صفحات کے نمبر ڈالنے پر اکتفا کیا گیا ہے۔

سرسید مرحوم نے ۱۸۸۶ء کو آل انڈیا ایجوکیشن کانفرنس علی گڈھ میں قائم کی تھی۔ اس کانفرنس کے ۱۸۸۶ء سے ۱۹۰۶ء تک کے چالیس خطبے "خطبات عالیہ" میں ۱۹۲۷ء کو شائع ہوئے تھے۔ ان خطبوں کے ساتھ جن حضرات نے بحیثیت صدر کانفرنس میں خطبے پڑھے تھے ان کے حالات بھی درج ہیں۔

سرسید مغفور کے ساتھی زیادہ تر حکومت برطانیہ کے ہمنوا، ہمدرد اور حامی تھے اور ایسے بھی تھے جنہوں نے حکومت برطانیہ کی حمایت و ہمنوائی کرنے

کے لئے جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کو ناکام کرنے کی کوشش کی تھی اور مجاہدین سے مقابلہ بھی کیا تھا۔ یہ طبقہ ان لوگوں میں سے تھا جو ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی ناکامی پر فخر محسوس کرتا تھا۔ چنانچہ نواب حاجی فتح علی خاں کے حالات لکھتے ہوئے ان کے والد علی رضا خاں کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے۔

"ان ہی علی رضا خاں نے غدر ۱۸۵۷ء میں دہلی اور کاس گنج کے باغیوں کے مقابلہ میں کامیاب خدمات انجام دیں اور اب کی مرتبہ علی آباد کا علاقہ بہرائچ خدمات جنگی کے صلہ میں پایا۔"

اسی کتاب سے منشی سید امتیاز علی صاحب صوفی کاکوری اور سردار محمد حیات خاں حیات پٹیالوی کے حالات زندگی اخذ کئے ہیں۔ اس کے علاوہ خلیفہ محمد حسن وزیر اعظم پٹیالہ کے بزرگوں کے حالات بھی اسی کتاب کے اوراق سے دستیاب ہوئے ہیں۔

ہم نے ان شاعروں کے حالات قطعاً اس جذبہ کے ماتحت نہیں لکھے ہیں کہ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں چونکہ انہوں نے ملک و قوم کے ساتھ بے وفائی کی تھی اس لئے ہم ان کے ۱۸۵۷ء سے قبل یا بعد کے اچھے واقعات اور اچھے اعمال کو نظر انداز کر جائیں یا ان کو برے رنگ میں پیش کریں۔ تحقیق کے بعد جو واقعات و حالات ہمارے سامنے آئے ہم نے ان کو بے کم و کاست قلم بند کر دیا

۱۸۵۷ء کے غدار شعراء کے لواحقین و اعزاء کو اس کتاب سے یقیناً دکھ ہوگا۔ "الحق مر" حق کڑوا ہوتا ہے۔ اس لئے اس کو پینا اور سننا پڑتا ہے۔

اسی طرح ہمیں امید ہے کہ یہ حضرات بھی برداشت فرمائیں گے۔ اور حق وباطل میں تمیز کرنے پر مجبور رہوں گے۔

ہمیں ان شاعروں میں سے کسی سے بھی ذاتی عداوت نہیں ہے اور نہ ہی ہو سکتی ہے۔ اس لئے کہ ان حضرات نے ہمارا کچھ بگاڑا نہیں ہے اور بگاڑ بھی کیسے سکتے تھے جب ہماری زندگی میں ان کا وجود ہی نہیں تھا۔ اگر ان شعرار کے کسی عزیز دوست وعقیدت مند نے یہ ثابت کر دیا کہ ہماری تحقیق فلاں شاعر کے متعلق صحیح نہیں ہے تو ہم معذرت کے ساتھ دوسرے ایڈیشن میں ان کا نام نکال دیں گے۔ ہمارے پاس ان شعراء کے فوٹو ہیں۔ لیکن شائع کرنا مناسب نہ سمجھا۔

ہمارے سامنے اصول تاریخ نویسی ہے جو مستند، مدلل تاریخی واقعات وحالات ہمارے سامنے آئیں گے ہم اسے صفحۂ قرطاس پر لائیں گے۔ یہ ہمارا فرض ہے۔

۱۸۵۷ء کے حالات وواقعات پر ہماری چار جلدیں ہیں (۱) ۱۸۵۷ء کے مجاہد شعراء (شہید) (۲) ۱۸۵۷ء کے مجاہد شعرار (اسیر) (۳) ۱۸۵۷ء کے غدار شعرار (۴) ۱۸۵۷ء کی بہادر عورتیں۔

پہلی دو جلدیں زیر طبع ہیں۔ چوتھی جلد زیر ترتیب ہے۔ تیسری جلد آپ کے سامنے ہے۔ کیسی ہے، یہ خدا ہی جانتا ہے۔ آپ کو پسند آئی یا نہیں یہ آپ کا دل فیصلہ کرے گا۔ انسان خطاؤں کا مرکب ہے جو غلطی نظر آئے مطلع فرمائیں۔ دوسرے ایڈیشن میں تصحیح کر دی جائے گی۔

میرے قدیمی دوست جناب پروفیسر دیپ پرکاش مانک کو یہ کتاب بیحد پسند آئی انہوں نے اس کی طباعت کا وعدہ فرمایا تھا ــــ اب ان کی کوششوں سے یہ کتاب شائع ہو رہی ہے۔ انہوں نے اپنے حلقۂ احباب سے اس کتاب کی طباعت کا بار اٹھوایا ہے۔ میں ان کا اور ان کے احباب کا ممنون ہوں۔

امداد صابری

چوڑیوالان ــ دہلی۔

"۱۸۵۷ء کے مجاہد شعراء" کی طرح یہ کتاب "۱۸۵۷ء کے غدار شعراء" بھی بلا معاوضہ میں نے محمد یوسف صاحب مالک مکتبہ شاہراہ دہلی کو طباعت کے لئے دی ہے اور طباعت کے جملہ حقوق بھی ان کو دیدیئے ہیں۔

امداد صابری

محلہ چوڑی والان۔ دہلی

داروغہ سید واجد علی لکھنوی

جناب داروغہ سید واجد علی تسخیرؔ لکھنؤ کے رئیس تھے۔ یہ حضرت امیرؔ لکھنوی کے ارشد تلامذہ میں سے تھے اور واجد علی شاہ کی بیگم سلطان محل کے داروغہ تھے اور محلات شاہی میں اور بھی خدمتیں ان کے سپرد تھیں۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی جب لکھنؤ میں شروع ہوئی تو برجیس قدر اور حضرت محل کی قیادت میں جنگی کونسل کی تشکیل ہوئی۔ دیوان شرف الدولہ محمد ابراہیم خلیل، کوتوال مرزا علی رضا بیگ، جرنیلی حسام الدولہ، منشی کچہری امیر حیدر، داروغہ ڈیوڑھیات میر واجد علی، علی محمد خاں عرف ممو خاں داروغہ دیوان خاص مقرر و منتخب ہوئے۔

ان لوگوں میں زیادہ تر ایسے لوگ تھے جو برجیس قدر اور حضرت محل کو دھوکہ دے رہے تھے اور انگریزوں سے سازباز رکھتے تھے جن میں داروغہ میر واجد علی

بھی تھے۔ انہوں نے دوران جنگ میں قدم قدم پر انگریزوں کی حمایت کی اور مجاہدوں کو کمزور کرتے رہے۔

۲۵ ذی الحجہ ۱۲۷۳ھ کو جوزف اسٹارٹ اور جوزف جوہانس مع چودہ اشخاص دولت گنج میں علی حسن تھانیدار کے مکان میں پوشیدہ طور پر جا رہے رائن صاحب پہلے حسین بخش چیلے کے مکان میں پوشیدہ تھے اس دن یہ بھی ان لوگوں کے پاس آ گئے۔ پھر وہاں سے مرزا محمد تقی ہوس اپنے گھر میں لالچ کی وجہ سے ان لوگوں کو لے آئے۔ مرزا تقی کے بیٹے محمد حسن عسکری نے ان لوگوں سے کچھ مانگا۔ یہ ناداری کی وجہ سے کچھ نہیں دے سکے تو حسن عسکری نے میر یوسف علی سے جا کر کہا کہ ہمارے محلے میں انگریز آ کر چھپے ہیں۔ یوسف نے ممو خاں کو یہ خبر پہنچائی۔ خبر پہنچنے کی دیر تھی کہ تلنگے مکان پر پہنچ گئے۔ سب کی مشکیں باندھیں اور بازاروں میں سے چکر دلاتے ہوئے برجیس قدر اور حضرت محل کی خدمت میں ان کو پیش کر دیا۔ تلنگے ان کو گولی سے اڑانا چاہتے تھے کہ مفتاح الدولہ نے سفارش کی تو یہ لوگ میر واجد علی کے سپرد ہوئے۔ انہوں نے یہ سمجھ کر کہ اب سرکار انگریزی کی حمایت میں رہنا بہتر ہے[1]، ایک کرایہ کے مکان میں لے جا کر ان کو رکھ دیا۔ اور ان کی جان بچانے کے لئے یہ حیلہ اور صورت نکالی اور یہ مشہور کر دیا کہ جوزف جوہانس بندوق کی ٹوپیاں بنانا جانتے ہیں۔ چنانچہ داروغہ واجد علی کئی سو ٹوپیاں اپنی طرف سے لے جا کر برجیس قدر اور حضرت محل کی خدمت میں پیش کرتا تھا اور کہتا تھا کہ یہ انہوں نے ہماری فوج

[1] تواریخ اودھ صفحہ ۲۴۶۔

کے لئے بنائی ہیں۔ اس نے ان سب کی ڈاڑھیاں بڑھوا دی تھیں۔ یہ لوگ کرتے مشائخی پہنتے تھے سر پر عمامے بادامی باندھ رکھے تھے اور ہاتھ میں بڑے دانوں کی زیتون کی تسبیح لے رکھی تھی۔ [1]

دوران جنگ میں جب بھی نازک وقت آتا تو مجاہدین دار وغہ میر واجد علی سے مشورہ کرتے تھے کہ اب کیا طریقہ و تدبیر اختیار کریں تو اس وقت دروغہ صاحب ان کو ڈانٹ دیتے تھے اور جنگ میں حصہ لینا تو کجا مشورہ بھی نہیں دیتے تھے۔

چنانچہ جب اونام اجگیں، مکرواره گاؤں کے قریب جو سڑک تھی اس پر انگریزی فوج نے خوب لوٹ مار کی جس کی وجہ سے ان گاؤں کے لوگ بھاگ گئے اور جو تھوڑے بہت بچے وہ بھی جانے کے لئے آمادہ تھے۔ افسرانِ مجاہدین نے ان حالات کو دیکھتے ہوئے ان سے مشورہ کیا کہ اب کیا کرنا چاہئے دروغہ صاحب فرماتے ہیں۔

"ہم کیا خاک تدبیریں کریں گے، کس واسطے تم سب جنگی ہو لڑنا لڑانا تمہارا کام ہے، اس کی تدبیر تم کر سکتے ہو۔ اب تم خواہ بھاگو یا لڑو یہ سب عزت تمہارے ساتھ ہے۔ تم کپتان ہو پانچسو پاتے ہو۔ اپنے جرنیل کو ساتھ لو یا خود جاؤ لڑو اگر ہم جاویں تم کو کس واسطے نوکر رکھا ہے۔" (ص ۲۵۹)

میر واجد علی انگریزوں سے ملے ہوئے تھے۔ مجاہدین کو بددل کرنے

[1] قیصر التواریخ دوئم ص ۲۴۷۔

کے ساتھ ان کا کام یہ بھی تھا کہ انگریزی افسروں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے انگریزوں کی جانیں بچاتے تھے۔

چنانچہ جب لکھنؤ میں انگریزوں کی فتح کے آثار دکھائی دینے لگے تو میر واجد علی کو مقید آر صاحب کے نکالنے کی فکر ہوئی کہ اگر ان کو جلد نہ نکالا گیا تو تلنگے بھاگتے وقت ان کو مار ڈالیں گے۔ اس سازش کی اطلاع جب احمد اللہ شاہ کو ہوئی تو انہوں نے آر صاحب کی تلاش کی اور اس میں کامیاب ہوئے آر صاحب سے شاہ صاحب نے پوچھا کہ تم قید میں رہتے ہوئے بھی کچھ دبلے نہیں ہوئے تندرست اور تیار ہو، تم کو قید میں کچھ بھی تکلیف نہیں ہوئی میز کرسی بھی لگی ہوئی ہے تم کو کون اس طرح آرام سے رکھتا ہے اس کا نام بتاؤ۔ اس نے کہا میں نام تو نہیں جانتا لیکن ایک مشہور داروغہ اور جمعدار تھے وہ اکثر میرے پاس آیا کرتے تھے۔ آر صاحب کے قتل کرنے کے بعد داروغہ واجد علی کی تلاش ہوئی۔ یہ پانچ روز تک روپوش رہے بمشکل تمام ان کے لئے جو سفارشیں کی گئی تھیں وہ منظور ہوئیں جب شاہ صاحب نے انہیں پروانہ امان دیا۔[1]

نصرت جنگ راجہ جے لال سنگھ خلف غالب جنگ راجہ درشن سنگھ بہت قابل اور لائق آدمی تھے اور اپنی دانائی و فراست سے عہدہ کلکٹری اور ممالک محروسہ کے اہتمام اور شہر کے انتظام کے لئے مقرر ہوئے تھے لکھنؤ کی جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں مجاہدین راجہ صاحب سے صلاح و مشورہ کرتے تھے۔ یہ جنگ کی ناکامی کے بعد کپتان آر صاحب کے قتل کے الزام میں گرفتار ہوئے۔

[1] قیصر التواریخ دوم ص ۲۸۵۔

کئی مہینے تک جیل میں بڑی مصیبتیں جھیلیں اور ایسے مصیبتوں کے پہاڑ ان پر توڑے جاتے تھے کہ زندگی سے تنگ آگئے تھے۔ آخر کار مقدمہ دائر ہوا اور پھانسی کا حکم سنایا گیا۔ یکم اکتوبر ۱۸۵۹ء مطابق ۲ ربیع الاول ۱۲۷۶ھ کو اسی مقام پر جہاں آر صاحب کو قتل کیا گیا تھا راجہ صاحب لائے گئے۔ ہزاروں لوگ ان کی پھانسی کا منظر دیکھنے کے لئے جمع ہو گئے تھے۔ راجہ صاحب نے اپنے ہاتھ سے پھانسی ڈالی جب تختہ کھینچ لیا اور دم نکل گیا تو ڈیڑھ روپے کا کفن دیکر وہیں آر صاحب کی نقش والی لاٹ کے پاس ان کو دفنا دیا گیا۔ ان کی مخبری کرنے والے داروغہ میر واجد علی صاحب تھے۔ [1]

جب انگریزی فوج کوٹھی جنرل مارٹن محمد باغ کے قریب پہنچی تو داروغہ میر واجد علی نے ان میموں کو جو بہادروں کی نظروں سے اوجھل تھیں ان کو نواب محسن الدولہ کے مکان واقع گھڑیا بی میں بھیجدیا تھا۔ پلٹن نادری کے تلنگے جب قیصر باغ سے بھاگ کر اسی مقام پر پڑاؤ ڈالنے لگے تو داروغہ کے سپاہیوں نے کہا کہ یہاں محلات واجد علی شاہ اور بیگمات میر واجد علی رہتی ہیں ہم یہاں تم کو نہیں اترنے دیں گے۔ تلنگوں نے اس کی بات کو نہیں مانا۔ ایک چپراسی نے داروغہ کو خبر دی۔ انہوں نے میموں کو نال دروازہ میں سے چودھری جگن ناتھ کے مکان میں منتقل کر دیا۔ دو دن کے بعد انگریزی فوج نے مکان نواب محسن الدولہ بینا بازار پر حملہ کیا۔ جب میموں کے مکان کے قریب گولیاں آنے لگیں تو وہاں سے ان کو محلہ منصور نگر میں جہاں نواب

[1] تواریخ اودھ ص ۳۶۱۔

خرد محل سلطان اور بہت سی عورتیں بھیس بھیجدیا۔ نواب خرد محل نے ان میموں کو بڑی احتیاط کے ساتھ کوٹھے کے ایک کمرہ میں رکھا کہ کہیں ماما اور لونڈیوں کو خبر نہ ہو جائے۔

جب احمد اللہ شاہ نے حضرت عباسؓ کی درگاہ میں آکر مورچہ بنایا تو وہ منصور نگر کے قریب تھا میر واجد علی نے ان میموں سے ایک چٹھی انگریزی افسران کو لکھوائی کہ ہم میر واجد علی کے مکان میں سکونت پذیر ہیں یہاں مجاہدوں کے چاروں طرف ہم گھرے ہوئے ہیں جو صاحب اس چٹھی کو دیکھے فوراً فوج کے ذریعہ ہم کو یہاں سے لے جائے۔ داروغہ میر واجد علی نے ایک شخص کو بیس روپے دیکر یہ چٹھی روانہ کی۔ راستہ میں اکبری دروازہ کے قریب دو نیپالی افسر اس کو ملے۔ اس چٹھی کو دیکھ کر وہ دو کمپنی لیکر میموں کے مکان پر آئے۔ نواب خرد محل نے ان میموں کو سیاہ لباس اور زیور پہنا کر داروغہ کی پنیس میں روانہ کر دیا۔ مجاہدین کو خبر ہوئی تو انہوں نے آکر گھیر لیا۔ داروغہ نے پھاٹک پر قفل لگا دیا کہ کہیں مکان میں داخل ہو کر قتل نہ کر دیں اور گارد کو کوٹھے پر چڑھا دیا کہ وہاں گولیاں چلاؤ تاکہ مجاہدین سمجھیں کہ یہاں انگریزی فوج ہے۔

جب یہ میمیں لشکر جنگ بہادر میں پہنچیں تو جنگ بہادر نے ان کے لئے خیمے نصب کرائے اور اس میں اتارا میموں نے داروغہ کی جنگ بہادر سے ملاقات کرائی۔ اس کے بعد میر واجد علی کی کمانڈر انچیف سے ملاقات ہوئی۔

تیسرے دن داروغہ آر صاحب کی معرفت جنرل اوٹرم کے پاس گئے صاحب کھڑے ہو گئے اور ان کی مزاج پرسی کی اور تسلی و تشفی دیکر کہا ایک لاکھ

روپے انگریزی سرکار نے تمہیں انعام میں دیئے ہیں۔ پھر داروغہ واجد علی کو ایک چٹھی لکھ کر دی جس کا مضمون یہ تھا۔ حکم دیا جاتا ہے کہ کوئی فوج کا سپاہی میر واجد علی داروغہ کے مکان پر نہ جاوے اور ان کے متعلقین کو بھی نہ ستاوے۔ یہ خیر خواہ اور متوسل انگریزوں کی حفاظت میں ہیں۔ چنانچہ یکم نومبر ۱۸۵۸ء کو داروغہ میر واجد علی کو ایک لاکھ روپیہ انعام کا ملا۔ [۱]

لالہ سری رام مؤلف خم خانہ جاوید جناب تسخیر کی حضرت محل اور برجیس قدر سے بے وفائی اور ملک سے غداری کا ان الفاظ میں ذکر کرتے ہیں۔

"ایام غدر میں جب مرزا برجیس قدر کا دور دورہ ہوا تب آپ حضرت محل کے صلاحکاروں میں رہے۔ مگر جب آپ کو یہ معلوم ہوا کہ اس بد نظمی کا انتظام اچھا نہیں تو ارادہ دور اندیشی آپ سرکار انگلیشہ کے ہوا خواہ بن گئے اور خدمات شائستہ اس سرکار کی ادا کیں۔ چنانچہ بجلدو خیر خواہی بعد فرو ہنگامہ چند مواضع بطور انعام پائے اور زمرہ تعلقداران میں محسوب کیے گئے۔ تمام عمر باعزاز و آبرو بسر کی۔" [۲]

صاحب گلدستہ سخن ان کے مداح ہیں۔ تحریر کرتے ہیں۔ [۳]

"اخلاق و مروت یگانہ زمانہ، یاروں کے یار، جس سے محبت ہے پاک دل سے، مذہبی عقائد میں سچے دیانتدار، ہر سال متواتر مجلس اور خیرات اور خصوصاً عشرہ محرم میں یکم تاریخ سے تا عشرہ برابر تقسیم پخت اور مجلسیں ہوتی ہیں۔"

---

[۱] قیصر التواریخ دوئم صفحہ ۳۰۷ تا ۳۰۸ [۲] خمخانہ جاوید دوئم صفحہ ۶۵ [۳] گلدستہ سخن صفحہ ۱۳

آپ کے بڑے صاحبزادے نظیر حسین تعلقدار تھے۔ چھوٹے بیٹے امیر حسن فروغ حیدرآباد میں وکالت کرتے تھے۔ جناب تسخیر کا کلام درمیانہ ہے۔ خاصے اچھے شعر کہتے ہیں۔ زبان میں روانی و شگفتگی ہے۔ محاورے بھی باموقع استعمال کرتے ہیں۔ ؎

نہ آیا فاتحہ پڑھنے وہ مہر و مہرباں ہو کر
زمین قبر کیوں پیسے نہ ہم کو آسماں ہو کر
نکل سکتا ہے وحشی کس طرح زلفوں کے پھندوں سے
پڑا ہے پاؤں ان کا تصور بیڑیاں ہو کر
لحد میں یاد جب آئی کشاکش زلف پیچاں کی
کفن کے بند جتنے تھے وہ پٹے رسیاں ہو کر
نہ کھینچ اب تیغ ابرو، دل نشانہ ہو چکا ظالم
در آئی ہر مژہ کی نوک سینہ میں سناں ہو کر
تلاش ناقہ لیلیٰ میں دی مجنوں نے جاں اپنی
اسی کی خاک پھرتی ہے غبار کارواں ہو کر
ازل سے دل مرا مشتاق ہے ابروئے پیکاں کا
نہ مارا تم نے اک تیر نگہ ابرو کماں ہو کر
جفا تیری وفا میری الم نشرح ہے گھر گھر
یہی قصہ بیاں ہوتا ہے ہر جا داستاں ہو کر
تمہیں پر ہم نے گل کھائے تمہیں نے قتل کر ڈالا

اجاڑا تم نے خود گلزار اپنا، باغباں ہو کر
نہ حرف تلخ لب پر لائیے شیریں زباں ہو کر
سخن میں رنگ و بو دکھلائیے غنچہ دہاں ہو کر
اسے دن رات پامالی، اسے چکر میں بے حالی
نہ یاں راحت زمیں ہو کر، نہ آرام آسماں ہو کر
عدم میں جانے والے منزل آخر پہ جا پہنچے
میں تنہا رہ گیا پیچھے، غبار کارواں ہو کر
نزاکت کس قدر ہے پھول کے گجرے جو پہنے ہیں
جھکے جاتے ہیں دونوں ہاتھ گل کی ڈالیاں ہو کر
دلا گر چاہتا ہے دلربا تنہا ملے تجھ کو
بتا دیں راستہ سیدھا تو جا واں لامکاں ہو کر
تلون ہے طبیعت میں تمہاری کس قدر توبہ
نہیں پھر ہو گئی تو وصل کے وعدہ پہ ہاں ہو کر
نجف کی راہ تو تسخیر پھرتے ہو کہاں در در
لگاؤ بستر اموئے کے در پر پاسباں ہو کر
کیا تعجب ہے جو وہ حور پری بن کے اڑے
بازوؤں پر جو پڑے بن گئے شہپر گیسو
ہر بلندی کا ہے انجام جہاں میں پستی
دیکھو سر چڑھ کے گرا پائے صنم پر گیسو

عنبر و مشک کی بو آنے لگی مٹی سے

یاد آئے جو ہمیں قبر کے اندر گیسو

جتنے حلقے ہیں چمکتے ہیں وہ مانند ہلال

نور عارض سے ہوں ایسے منور گیسو

دو ہلالوں کے ہے آغوش میں اک مہر منیر

خوشنما کتنے ہیں گردِ رخِ انور گیسو

ان کے کاٹے کا نہ منتر، نہ دوا ہے نہ علاج

سانپ کو ماریں ایسے ہیں یہ کافر گیسو

ان کے حلقوں میں مئے حسن بھری ہے جو مدام

مست کرتے ہیں ہمیں صورت ساغر گیسو

تیرھواں سال ہے عشاق سے شرماتے ہیں

موہنھ چھپا لیتے ہیں بکھرا کے وہ رخ پر گیسو

نہ کسی سانپ نے کاٹا نہ کسی بچھو نے

مار ڈالا مجھے موذی نے سنگھا کر گیسو

عطر مل کر سر بازار وہ اتراتے ہیں

گل سے رخساروں پہ چھوڑے ہوئے اکثر گیسو

شاخ سنبل میں لٹکتے نظر آئے دو سیب

آتے اس گل کے جو پستاں کے برابر گیسو

ہم تو ترسا کریں، رخسار کا وہ بوسہ لیں

رشک آتا ہے ہمیں دیکھ کے رخ پر گیسو

بیچ میں ان کے خبردار نہ آنا تسخیرؔ

کاٹ کھائیں گے کسی روز پلٹ کر گیسو

••

حسنؔ

خلیفہ محمد حسن پٹیالوی

خلیفہ محمد حسن کے بزرگ سید جلال الدین حسین المعروف سید جلال بخاری تھے جو بخارا سے شہر ملتان میں ۶۳۵ھ میں تشریف لائے۔ حضرت جلال بخاری کا مزار اُچ شریف ریاست بھاول پور میں مرجع خاص وعام ہے۔ سید جلال بخاری کے پوتے سید جلال الدین مخدوم جہانیاں جہاں گشت تھے۔ حضرت جہانیاں جہاں گشت کی اولاد میں سید نظام الدین صاحب دہلی سے ۸۰۲ھ میں آکر سامانہ میں آباد ہوئے۔ یہ ایک پرانا اور مشہور قصبہ ہے جو پٹیالہ سے اٹھارہ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔

ان ہی بخاری سادات سامانہ میں سے حکیم سید غلام حسن جو اپنے زمانہ کے ایک مشہور اور نامور طبیب گذرے ہیں خلیفہ محمد حسن کے دادا تھے جو مہاراجا نرسنگھ اور مہاراجہ اندر سنگھ کے عہد حکومت میں اطبائے خاص تھے۔ حکیم منشی سید

سعادت علی خاں ان کے بیٹے اور خلیفہ محمد حسن کے والد تھے۔ عرصہ دراز تک طبیب شاہی کی حیثیت سے اپنے فرائض منصبی مہاراجہ کرم سنگھ والیٔ پٹیالہ کی خدمت میں بجالاتے رہے۔ اس کے بعد مہاراجہ موصوف نے ان کی قابلیت و لیاقت دیکھ کر ان کو اپنے ولی عہد و جانشین مہاراجہ نرندر سنگھ کا اتالیق مقرر فرمایا۔ اس کے بعد سالہائے دراز تک میر منشی ریاست رہے۔ ریاست میں ان کی عزت و قدر و منزلت اور احترام اس قدر تھا کہ ان کو وزیر اعظم کہنا چاہیئے تھا۔ دیوان، بخشی حاکم صدر عدالت سب ان کے مشورہ سے کام کرتے تھے اور مشورہ کرنے کے لئے سب ان کے ہاں جمع ہوتے تھے۔ اتالیقی کی نسبت سے سید صاحب کا خاندان خلیفہ کے لقب سے مشہور تھا۔ خلیفہ سے مراد استاد کا بیٹا ہے۔ سید سعادت علی کے بعد اتالیق کا عہدہ ان کی اولاد میں مختلف ولی عہدوں کے لئے سلسلہ وار قائم رہا اس لئے لفظ خلیفہ اس خاندان کے لئے عام طور سے استعمال ہونے لگا۔ [1]

خلیفہ محمد حسن ۱۶ سال کی عمر میں علوم مروجہ عربی و فارسی پڑھ کر فارغ ہوئے تو پہلے مہاراجہ نرندر سنگھ کے مصاحب ہوئے۔ اس کے بعد محکمہ کارخانجات میں جو کاغذات مہاراجہ کو سنائے جاتے تھے اس خدمت پر مامور ہوئے۔ پھر عدالت کے صدر کے سررشتہ دار ہوئے۔ جب کہ اس زمانہ میں سررشتہ داری بڑے عہدے کے برابر مانی جاتی تھی۔ تمام کاغذات مہاراجہ صاحب کی حضور میں پیش کرنے اور حکم احکام لکھانے کے ذمہ دار تھے۔ اس کے بعد ضلع امرگڑھ کے جج

[1] خطبات عالیہ صفحہ ۲۶۔

اور مجسٹریٹ مقرر ہوئے۔ ۱۸۵۶ء میں جب کہ ریاست کا کچھ تعلق ممالک مغربی شمالی سے تھا اور اس زمانہ میں نینی تال میں کالون صاحب لفٹنٹ گورنر تھے تو ریاست کی طرف سے نینی تال میں وکیل رہے۔ بعد ازاں سردار نرائن سنگھ داماد مہاراجہ نرندر سنگھ کے اتالیق مقرر ہوئے۔ مہاراجہ صاحب کے ذہن میں یہ بات پیدا ہوئی کہ آئندہ عدالتوں کا انتظام انگریزی طور وطرز پر ہونا چاہئے۔ اس وقت خلیفہ صاحب ضلع بھوانی گڑھ کے جج اور مجسٹریٹ مقرر کئے گئے۔ آغاز ۱۸۵۷ء میں صدر عدالت کے حاکم ہوئے یعنی راج کی کل فوجداری ان کے سپرد ہوئی۔ اسی سال جنگ آزادی ۱۸۵۷ء چھڑی۔

مہاراجہ صاحب نے ایک دو سرداروں کے ساتھ ان کو تمام پولٹیکل معاملات کی نگرانی اور ہر ایک قسم کی کارروائی، فوج کی بھرتی اور اس کی دیکھ بھال کے لئے مقرر کیا۔ اور مہاراجہ خود فوج لیکر انبالہ تھانیسر کے مقام پر پہنچے اور جب جالندھر کی مجاہدوں کی فوج آگئی تو خلیفہ صاحب اور دو ایک اور جنگی افسران کو نکالنے کے لیے متعین ہوئے۔ حکومت برطانیہ کی جانب سے سر ڈگلس فورسایتھ ڈپٹی کمشنر انبالہ، ہٹوال صاحب اسسٹنٹ کمشنر ضلع انبالہ، اسپنکی صاحب مجسٹریٹ ضلع سہارنپور متعین تھے۔ جنہوں نے مجاہدوں کی فوج کو جمنا پار نکال دیا تھا۔

دہلی کی جنگ آزادی میں حملہ کے وقت یعنی اس وقت جب کہ دہلی کو انگریزوں نے فتح کیا تھا، خلیفہ صاحب پٹیالہ فوج کی نگرانی کے لئے موجود تھے۔ علی پور اور سرسوئی اور رائی جو دہلی کے راستے پر ہیں یہاں بھی خلیفہ صاحب

اپنے کیمپ کے ساتھ موجود تھے۔ یہاں گورنمنٹ کی جانب سے کرنیل ملکنزرو جو اس وقت کپتان تھے اور کرنیل وسفرڈ پولٹیکل افسر تھے وہ بھی موجود تھے۔ سلہ

جب مہاراجہ نرندر سنگھ کو ان کی خدمات کے صلے میں حکومت برطانیہ کی جانب سے نارنول کا علاقہ ملا ہے تو خلیفہ کو ان کی خدمات کی وجہ سے مہاراجہ نے ان کو بھی جاگیر دی تھی۔

ابتدا ۱۸۵۸ء میں عدالت صدر پٹیالہ کا دیوانی کام ان کے سپرد ہوا۔ ۱۸۶۰ء تک پھر حاکم صدر عدالت پٹیالہ رہے ۱۸۵۶ء اور ۱۸۵۵ء میں خلیفہ صاحب مہاراجہ مہندر سنگھ مہندر بہادر کے اتالیق بھی رہے ۱۸۶۰ء کے بعد میر منشی ریاست ہوئے۔ ریاست میں چونکہ عدالت کے کاموں کے واسطے ان سے بہتر کوئی آدمی نظر نہیں آتا تھا، ان ہی کو حاکم صدر عدالت مقرر کیا گیا۔

۱۸۶۲ء میں مہاراجہ نرندر سنگھ کا انتقال ہوا۔ مہاراجہ مہندر سنگھ نابالغ تھے۔ آپ ریاست کی نگراں کونسل کے ممبر بنائے گئے۔ جب مہاراجہ مہندر سنگھ کو ریاست کے اختیارات حاصل ہوئے تو خلیفہ محمد حسن صاحب وزیر ریاست قرار دیئے گئے اور ان کے چھوٹے بھائی محمد حسین میر منشی مقرر ہوئے۔

مہاراجہ مہندر سنگھ کے عہد حکومت میں خلیفہ محمد حسن تمام اختیارات کے مالک تھے۔ مہاراجہ مہندر سنگھ شراب نوشی کی وجہ سے مدہوش بدمست رہتے تھے۔ چنانچہ اسی کثرت میخواری کی وجہ سے مہاراجہ صاحب کا ۱۲ اپریل ۱۸۷۶ء

سلہ اودھ اخبار ۱۸ مئی ۱۸۷۶ء

کو انتقال ہوا۔[1]

مہاراجہ مہندر سنگھ کی خفگی و ناراضگی کی وجہ سے بہت سے لوگ شہر بدر کر دیئے گئے تھے۔ شہر و دیار میں مارے مارے پھر رہے تھے خلیفہ نے حکم دیا کہ اپنے گھروں میں آکر بسیں۔

کئی سو آدمیوں کو جن میں ماسٹر خدا بخش بھی تھے محض اس شبہ میں کہ مہاراجہ کے دشمن ہیں جیل میں پڑے ہوئے سڑ رہے تھے، خلیفہ صاحب نے ان کے مقدمات کی تحقیقات کر کے ان کو رہا کیا۔

خلیفہ محمد حسن سر سید احمد خاں مرحوم کی تعلیمی تحریک کے دست و بازو تھے اور مدرستہ العلوم علی گڑھ کے نامور ٹرسٹی تھے۔ ان کے اثر و رسوخ سے بیش بہا عطیہ اور مختلف امدادیں مدرستہ العلوم کو حاصل ہوئیں۔ وہ مذہباً راسخ العقیدہ شیعہ تھے۔ جب مدرستہ العلوم میں شیعوں اور سنیوں کے واسطے جدا جدا مسجدیں تعمیر کرنے کی تجویز اراکین کمیٹی کے سامنے پیش تھی، تو اس تجویز کی خلیفہ صاحب اور ان کے چھوٹے بھائی خلیفہ محمد حسین نے سختی سے مخالفت کی اور سر سید مرحوم کو لکھا کہ یہ تجویز اتحاد و یکجہتی کے اصول کے منافی ہوگی جس کے قائم کرنے کے لئے ہم سب نے کالج کی بنیاد قائم کی ہے۔ چنانچہ اس رائے پر تمام ٹرسٹیوں نے اتفاق کیا اور ایک ہی مسجد تعمیر ہوئی۔[2]

پرنس آف ویلز ۱۸۷۶ء میں ہندوستان آیا تھا۔ انگریزی حکومت کے

---

[1] ناصر الاخبار دہلی، یکم مئی ۱۸۷۶ء۔ [2] خطبات عالیہ ص ۲۶۱۔

حامیوں، نوابوں، مہاراجوں نے ان کا شاندار استقبال کیا تھا اور قصیدے بھی شعراء نے گذرانے تھے۔ جب پٹیالہ میں پرنس آف ویلز آیا تو خلیفہ محمد حسن وزیر اعظم پٹیالہ نے شہزادے کی خدمت میں حسب ذیل دو قصیدے پیش کئے جو ۱۲ فروری ۱۸۷۶ء کے ناصر الاخبار دہلی میں شائع ہوئے۔

پرنس آف ویلز آں شاہنشۂ دہر — مہندر سنگھ شہ را مہماں شد
ازیں لطف شہنشاہی چہ گویم — چساں ممتاز شاہ میزباں شد
زعز و شان و فخر و سر بلندی — ہما تا پائے شہ بر فرقداں شد
ازیں فرخندہ جشن میمنت زا — پر از شادی زمین و آسماں شد
چو تاریخ مسیحی جستم از غیب — بایں آواز ہاتف نغمہ خواں شد

مشیتا از سر حکم خدا سال
بگو خورشید باماہ ہمقراں شد

بسال مقدم شہزادہ پرنس آف ویلز — خوشا بنا زپئے یادگار وایں گنج
نقاقیافتہ حکم نگارش تاریخ — زبارگاہ علاوہ با متیں قافیہ سنج
بدید ہاتف غیبی چو فرق پائے عدد — سرود شعر لطیفے بصوت خوش آہنج

بنا نہاد مہاراجہ مہندر سنگھ
بنام نامی او البرٹ مہندر گنج

حیات

نجم الہند سردار محمد حیات خاں راولپنڈی

سردار محمد حیات خاں ابن سردار کرم خاں پوپلزئی سکنہ واہ ضلع راولپنڈی سپاہیانہ اوصاف کے ساتھ قدیم تعلیم و تربیت کا نمونہ تھے۔ انہوں نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے زمانہ میں برٹش گورنمنٹ کی وفادارانہ اور سرفروشانہ خدمات انجام دی تھیں۔ محاصرہ دہلی کے وقت خدمات جنگی میں یہ بھی مصروف تھے اور زخمی بھی ہوئے تھے۔ [۱]

برطانوی گورنمنٹ نے ان کی خدمات کی کافی قدر کی۔ ملازمت کے لحاظ سے انہوں نے اعلیٰ عہدوں اور مناصب پر ترقی پائی اور پنجاب کے بیشتر اضلاع میں جوڈیشنل کمشنر رہے۔ خان بہادر، سی، آئی، ای کے خطابات ملے حکومت میں باثر ہونے کے علاوہ پنجاب کے ہندو مسلمانوں میں وقعت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے اور عوام کی رہنمائی کے لئے ان

[۱] خطبات عالیہ صد ۲۲۔

کی ذات نمایاں تھی۔ یہ تجربہ کار، پرحوصلہ، زمانہ شناس اور اپنے زمانے کے صاحب تدبیر اشخاص میں شمار ہوتے تھے۔

سرسید احمد خاں نے جب تعلیم کو پھیلانے کا کام شروع کیا، سردار محمد حیات خاں تھوڑے عرصے کے بعد ان کے ہم خیال بن گئے تھے۔ پنجاب میں وہ سرسید کی علمی تحریک کے سب سے بڑے اور پرجوش حامی تھے۔ سرسید کے خیالات کا جماثر پنجاب نے قبول کیا اور ان کی زبان سے اہل پنجاب کے لئے "زندہ دلان پنجاب" کا لقب ملا وہ سردار حیات خاں اور برکت علی خاں کی پرخلوص اور ان تھک کوششوں کا نتیجہ تھا۔ انہوں نے علی گڈھ مسلم کالج کی تعمیر میں پوری دلچسپی سے حصہ لیا اور خود بھی مدد کی دوسروں سے بھی مدد دلوائی۔

۱۸۸۴ء میں سرسید نے پنجاب کا تاریخی سفر کیا۔ اس وقت سردار محمد حیات خاں ضلع گورداسپور میں جوڈیشنل کمشنر تھے انہوں نے وہاں آنے کی سرسید کو دعوت دی۔ سرسید، ۲۷ جنوری ۱۸۸۴ء کو اپنے احباب کے ہمراہ اسٹیشن گورداسپور پہنچے جہاں ان کا شاندار استقبال کیا گیا اور باشندگان ضلع کی طرف سے جو سپاسنامہ سرسید کو دیا گیا تھا اس کو سردار صاحب ہی نے پڑھ کر سنایا تھا۔ گورداسپور کے قیام کے زمانہ میں سرسید کو جو مختلف جماعتوں کی طرف سے ایڈریس دیئے گئے تھے۔ ان میں خاتونان پنجاب کا بھی ایڈریس تھا۔ اس ایڈریس کے پڑھنے کی خدمت بھی سردار صاحب کے سپرد ہوئی تھی۔

اس ایڈریس کے جواب میں سرسید نے جن خیالات کا اظہار کیا تھا اور جو رائے جس انداز سے دی تھی وہ اردو ادب میں بہترین اضافہ خیالات کے ساتھ آج تک

جان سخن ہے۔

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کو بنے ہوئے دو سال گذرے تھے کہ تیسرے سال کے سالانہ جلسہ کی صدارت کے لئے سر سید نے سردار محمد حیات کا نام تجویز کیا۔ کانفرنس ابتدائی مرحلہ میں تھی حامیوں اور مددگاروں کی کمی تھی۔ لہٰذا سردار صاحب سے ۱۸۸۸ء سے ۱۸۹۰ء تک لاہور، علی گڈھ، الہ آباد کے مسلسل تینوں اجلاسوں کی صدارت کرائی گئی۔

۱۸۸۸ء میں پنجاب میں پہلا تعلیمی اجلاس ہوا جو انجمنِ اسلامیہ کے اہتمام میں ہوا تھا۔ اس انجمن کے صدر سردار محمد حیات خاں اور جنرل سکریٹری برکت علی خاں تھے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ گروہ انگریزوں کا زبردست حامی تھا۔ جہاں وہاں سے زیادہ ان کی وقعت کرتا تھا مگر وطنیت میں کسی سے پیچھے نہیں تھا۔ ۱۸۸۹ء کے خطبہ صدارت میں سردار محمد حیات خاں نے تعلیمی پروگرام کی وضاحت کرنے کے بعد ان خیالات کا اظہار فرمایا تھا۔[1]

"میری آرزو ہے کہ تمام قیصری رعایائے ہند صرف اپنے مذہبی معبدوں میں تمیز ہو سکیں۔ ہندو مندروں اور شوالوں میں، عیسائی چرچ اور گرجوں میں، مسلمان مسجدوں اور خانقاہوں میں مگر ان متبرک مکانوں سے باہر تمام بھائی بھائی ہوں اور رحب حبِّ وطن کا جوش اس درجہ تک نہ پہنچے گا کہ کنٹری مین کی عزت کو اپنی

[1] خطبات عالیہ ص۵۵۔

عزت سمجھیں تب تک ہاؤس آف لارڈز کا کلنک ہم سے دور نہیں ہوگا
کیونکہ ہم اور ہندو ایک ہی خاک ہند کی پیدائش ہیں۔"

میرے کرم فرما اور بزرگ سردار رحیم بخش راولپنڈی نے سردار محمد حیات خاں کے حسب ذیل چار اشعار ارسال فرمائے ہیں اور وعدہ کیا ہے کہ ان کے خاندان کے بزرگوں سے اور اشعار حاصل کر کے روانہ فرمائیں گے۔ سردار رحیم بخش سردار محمد حیات خاں کے خاندان کے ایک بزرگ ہیں۔

بہت کی جستجو دیر و حرم میں — نہیں پایا کہیں مسکن کسی کا
مژدہ دید بھی قاصد سنا — کان ہے مدت سے اس آواز پر
سراپا آتشیں پیکر بنا دل — چھپاؤں اب کہاں سوز نہاں کو
الٰہی کیا تماشہ ہے عدم میں — کہ سب اٹھ اٹھ کے جاتے ہیں یہاں سے

••

خلیلؔ

نواب محمد ابراہیم خاں لکھنوی

شرف الدولہ نواب محمد ابراہیم خاں خلف خواجہ عبدالحکیم کشمیر کے رہنے والے تھے لکھنؤ میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ جب نوشیرواں عادل محمد علی بادشاہ تخت پر متمکن ہوئے تو غلام یحییٰ خاں کو قلمدان وزارت عطا ہوا۔ اس کے بعد منورالدولہ احمد علی خاں وزیر بنائے گئے۔ راجہ بہال لال دفتر سلطانی کے مہتمم مقرر ہوئے عظیم الدولہ حجام نے جب اقتدار جمایا تو منورالدولہ مستعفی ہوئے اور شرف الدولہ محمد ابراہیم خاں جو کلکتہ میں سفیر شاہی تھے، لکھنؤ بلائے گئے، وران کو وزارت کا عہدہ عطا کیا گیا اور شرف الدولہ خطاب ملا۔

محمد علی شاہ کے انتقال کے بعد جب امجد علی شاہ ۱۸۴۲ء کو بادشاہ بنائے گئے اور مجتہد العصر کو کلی اختیارات تفویض ہو گئے اور وہ سیاہ و سپید کے مالک بنا دیئے گئے۔ چونکہ نواب شرف الدولہ سنی تھے اس بنا پر ان کو وزارت کے

عہدہ سے ہٹا دیا گیا۔ ان کی جگہ امداد حسین خاں مقرر ہوئے۔ [1]

جب لکھنؤ میں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی شروع ہوئی تو ۱۲ ذی قعدہ ۱۲۷۳ھ کو برجیس قدر صاحبزادہ واجد علی شاہ کو مسند حکومت پر بٹھایا گیا اور شرف الدولہ محمد ابراہیم خاں نائب مقرر ہوئے۔ [2]

واجد علی شاہ کے تخت پر بیٹھنے کے بعد سے ہی انگریزوں نے واجد علی شاہ کو بے اثر کرنے اور لوگوں کے سامنے حقیر کرنے کے لئے جوڑ توڑ لگانے شروع کر دیئے تھے اور جس قدر بھی واجد علی شاہ کے دشمن و مخالف تھے یا نئے دشمن بنتے تھے، ان کو انگریزی حکام اپنا ہمنوا بنا لیتے تھے اور جو واجد علی شاہ کے مخصوص اور قابل اعتماد لوگ تھے ان کو ملازمت سے علیحدہ کر دیتے تھے اور ان کی جگہ واجد علی شاہ کی بیکسی اور بے بسی سے فائدہ اٹھا کر واجد علی شاہ کے معزول و معتوب۔ دشمنوں کا تقرر کرتے تھے۔

واجد علی شاہ کے تخت نشین ہونے سے قبل امجد علی شاہ کے عہد میں نواب امین الدولہ وزیر تھے۔ واجد علی شاہ نے اپنے ابتدائی عہد میں ان کو معزول کر کے ان کی جگہ نواب علی نقی کو وزیر مقرر کیا رزیڈنٹ نے نواب امین الدولہ پر دست شفقت پھیر کر اپنی طرف مائل کر لیا۔ چنانچہ جب گورنر جنرل کو لکھنؤ میں دعوت دی گئی تو رزیڈنٹ نے نواب واجد علی شاہ سے کہا کہ گورنر جنرل کا حکم ہے کہ امین الدولہ کو بھی اس دعوت میں بلایا جائے۔ قاعدہ کے مطابق معتوب شاہی اس قسم کی دعوتوں میں مدعو کرنے کا حق نہیں رکھتے تھے اور

[1] بہارستان اودھ صفحہ ۹۴۔ [2] تواریخ نادر العصر صفحہ ۱۳۴۔

اس بات کو معیوب سمجھا جاتا تھا۔ لیکن واجد علی شاہ نے مجبوراً امین الدولہ کو دعوت میں آنے کی اجازت دی۔ لہ

اسی طرح شرف الدولہ نواب ابراہیم خاں جب نیابت سے علیحدہ ہوئے تو انہوں نے بھی انگریزوں سے تعلقات بڑھانے شروع کئے۔ اور واجد علی شاہ کی امداد کے ساتھیوں کی مخالفت کرنی شروع کر دی۔ انگریزوں نے ان کو اپنایا اور اس بات کی کوشش کی کہ یہ حکومت کے کسی اچھے موثر عہدہ پر لگائے جائیں۔ واجد علی شاہ بھی ان کی حرکتوں سے واقف تھے اور ان کو اپنا مخالف سمجھتے تھے۔ شرف الدولہ وزارت کے امیدوار تھے لیکن واجد علی ان کو کسی عہدہ پر لگانے کے لئے آمادہ نہیں تھے۔ (۲۵)

نومبر ۱۸۵۲ء میں جب لکھنؤ میں گورنر جنرل آئے تو رزیڈنٹ کی کوٹھی پر دربار میں جانے سے قبل مخصوص لوگوں کی میٹنگ ہوئی۔ اس میٹنگ میں امین الدولہ عظیم الدولہ اور ممتاز الدولہ کے ہمراہ شرف الدولہ بھی تھے۔ (۳۰)

جب شرف الدولہ کے رزیڈنٹ سے زیادہ گہرے مراسم ہو گئے تو انہوں نے واجد علی شاہ کے قابل اعتماد لوگوں کی مخالفت رزیڈنٹ سے کرنی شروع کر دی اور مخبری کا سلسلہ بھی جاری کر دیا۔

مرزا وصی علی خاں کو واجد علی شاہ نے گورنر جنرل کی چاء پانی کے انتظام کیلئے مقرر کر دیا تھا۔ اس کے بعد سے واجد علی شاہ سے ان کی قربت بڑھتی چلی گئی اور قابل اعتماد لوگوں میں ان کا شمار ہونے لگا۔ چنانچہ واجد علی شاہ نے ان کو

لہ قیصر التواریخ دویم صفحہ ۳۰۔

واصلباقی کی خدمت پر مامور کیا۔ اور بعض خاص باتوں میں ان سے مشورہ بھی کرنے لگے تھے۔ (۴۶)

شرف الدولہ نے مرزا وصی کے خلاف رزیڈنٹ کو بھڑکانا شروع کیا کہ "یہ وہ شخص ہے جس کا پہلے بھی غیر ذمہ داریوں کی وجہ سے اخراج ہو چکا ہے۔ ایسا شخص مدار المہام بنایا جائے اور واجد علی شاہ ان سے تمام امور میں مشورہ لیں یہ حکومت انگریزی کی بدنامی کا باعث ہے۔" چنانچہ رزیڈنٹ نے ان کے خلاف تحقیقات شروع کر دی اور نواب علی نقی وزیر سے ان کے بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے لکھا کہ نواب امین الدولہ کے زمانہ میں ان پر کچھ الزامات لگائے گئے تھے، تحقیقات کے بعد یہ بالکل بے قصور ثابت ہوئے اور میرے زمانہ میں ان سے زیادہ قابل اعتماد آدمی کوئی نہیں تھا۔ اس لئے ان ہی کو گورنر جنرل کی چارپائی کے لئے بھیجا گیا تھا اور گورنر جنرل نے ان کی خدمات سے خوش ہو کر ان کو خلعت فاخرہ عنایت کیا تھا اور کپتان برڈ صاحب نے ان کو مرد "ذی عزت" لکھا تھا۔ ان ہی سابقہ خدمات کی بنا پر ان کو کاروبار کا منصرم مقرر کیا۔ نواب امین الدولہ کی شہادت کے بعد اور بھی تحقیقات ہوئی۔ ہر شخص نے ان کی تعریف کی اور قابل اعتماد قرار دیا لیکن چونکہ شرف الدولہ کو ان کی جگہ پر لگانا اور ان کو واجد علی شاہ کا قابل اعتماد آدمی سمجھ کر رزیڈنٹ کو ان کو علیحدہ کرنا منظور تھا۔ وصی علی خاں کو واصلباقی کے عہدہ سے معطل کر دیا اور اس کے بعد ان کو شہر بدر کرنے کا حکم دیدیا جس کو مجبوراً واجد علی شاہ کو بھی ماننا پڑا۔ ان کی جگہ شرف الدولہ اور غلام رضا خاں مقرر ہوئے۔ (۴۷)

مرزا وصی علی خاں ۶ ار رجب ۱۲۶۲ھ مطابق ۱۲ ار جون ۱۸۴۹ء کو لکھنؤ سے نکالے گئے اور فیض آباد پہنچے۔ یہاں سے انہوں نے اپنے شہر بدر ہونے کے حکم کو منسوخ کرانے کی کوشش کی اور ایلبٹ سکریٹری گورنر جنرل ہند کے پاس کلکتہ نایاب عمدہ کتابیں روانہ کرنے کے بعد ان کی توجہ اپنے حکم کی طرف مبذول کرائی اور اپنا ایک وکیل ان کے پاس بھیجا۔ اس نے ان کی طرف سے ایک درخواست گذاری۔ جس کا مضمون یہ تھا کہ میری طرف سے رزیڈنٹ کو بدظن کیا گیا ہے جس کی وجہ سے رزیڈنٹ نے مجھ کو شہر بدر کر دیا ہے۔ میں بے قصور ہوں مجھے میرے وطن پہنچایا جائے۔ میں امورات شاہی میں مداخلت نہیں کروں گا۔ چنانچہ ایلبٹ صاحب نے رزیڈنٹ کو لکھا کہ مرزا وصی علی خاں تمہارے کاموں میں کسی قسم کی مداخلت نہیں کریں گے۔ واجد علی شاہ سے بھی کوئی تعلق نہیں رکھیں گے۔ اگر مناسب سمجھو اور تمہارے کاموں میں یہ حارج نہ ہوں تو ان کو اپنے وطن میں رہنے کا حکم دیدو۔ چنانچہ ان کو لکھنؤ میں رہنے کی اجازت رزیڈنٹ نے دیدی۔ لیکن یہ پوشیدہ طور پر واجد علی شاہ سے ملتے رہے جس کی اطلاع رزیڈنٹ کو پہنچتی رہی۔ (۵۱)

ایک دن مسیح الدولہ سفیر شاہی نے رزیڈنٹ کو بتایا کہ تمہاری کوٹھی میں آدھی رات کو چار آدمی داخل ہوئے تھے تلنگوں نے بندوق چلائی تو وہ بائیں باغ بھاگ کر چلے گئے۔ چار آدمی مرزا وصی علی خاں، کپتان بارلو ملازم کپتان آر صاحب، جیکب جونس اور حضور عالم تھے جن پر رزیڈنٹ کا شبہ ہی نہیں بلکہ یقین تھا۔ ان چاروں کو واجد علی شاہ نے بلایا اور کہا جس شخص نے ایسا فعل قبیح کیا ہے وہ میری سلطنت کا اور میرا دشمن ہے۔ ان لوگوں

نے انکار کیا کہ ہم نے ایسا نہیں کیا ہے۔ (۹۷)

مرزا وصی علی خاں کے بارے میں مشہور تھا کہ یہ کشمیری لوگوں کو جمع کر کے عمل پڑھواتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ظاہر ہوا کہ ریذیڈنٹ سلطانی رمنہ میں کھانے کے لئے جا رہے تھے کہ عربی گھوڑے سے گر پڑے۔ جان بچ گئی لیکن ٹانگ میں کافی چوٹ آئی۔ ریذیڈنٹ کا پختہ خیال ہو گیا تھا کہ بادشاہ اور وصی علی خاں میرے تبادلے کے لئے کوشاں ہیں۔ چنانچہ ایک دفعہ ریذیڈنٹ نے راجہ بھاورسنگھ سے کہا کہ وصی علی خاں اور مظفر حسین ہمارے تبادلے کے لئے بادشاہ سے تین لاکھ روپے مانگتے ہیں اگر ہم کو وہ ایک لاکھ روپیہ دیدے تو ہم بخوشی ولایت چلے جائیں۔

شرف الدولہ حسین اسے نہیں بیٹھتے تھے مرزا وصی کے خلاف اس قسم کی درخواستیں بھجواتے رہتے تھے کہ "۹ مارچ ۱۸۵۲ء کو جعل سازی کا الزام لگا شہر بدر ہوئے کاکوری پہنچے لیکن پھر بھی واجد علی شاہ سے ملنا جلنا بند نہیں کیا چھپتے چھپاتے ان سے مل آتے ہیں" (۹۸)

ایک روز ریذیڈنٹ نے ایک کاکوری کے رئیس سے باتیں کرتے ہوئے کہا کہ مرزا وصی علی خاں منشی مسیح الدین خاں کے ہاں مہمان ہیں۔ اس نے بتایا کہ واجد علی شاہ کی طرف سے انہیں یہ حکم ملا ہے کہ ممالک محروسہ شاہی میں جہاں چاہو وہاں رہو۔ (۹۸)

واجد علی شاہ جب شرف الدولہ کی شرارتوں سے تنگ آ گئے تو انہوں نے ریذیڈنٹ کو لکھا کہ آپ مرزا وصی علی خاں کو غلط اور غیر ذمہ دار سمجھتے ہیں

تو میں شرف الدولہ محمد ابراہیم خاں کو غیر موزوں اور غیر ذمہ دار سمجھتا ہوں اس لئے میں شرف الدولہ کو شہر بدر کرنے کا حکم دیتا ہوں۔ (۹۹)

ظاہرہ طور پر رزیڈنٹ نے اس حکم کی مخالفت نہیں کی۔ چنانچہ ۹ ربیع الاول ۱۲۷۳ھ کو مرزا علی بیگ کوتوال شرف الدولہ کے پاس آئے اور شاہی حکم سنایا۔ شرف الدولہ نے فوراً رزیڈنٹ کو اپنی کہانی لکھ کر بھیجی۔ اس نے لکھا اپنے گھر سے سوار ہو کر لوہے کے پل سے سیدھے چھاؤنی چلے آؤ۔ یہ چھاؤنی پہنچے اور رزیڈنٹ کی معرفت گورنر جنرل سے خط و کتابت کی گورنر جنرل نے ان کو لکھنؤ میں رہنے کا حکم دیا اور اس حکم سے رزیڈنٹ نے واجد علی شاہ کو مطلع کیا۔ واجد علی غریب کیا کر سکتے تھے قہر درویش برجان درویش۔ انہوں نے فرمایا مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ شرف الدولہ لکھنؤ میں مقیم ہو جائیں۔

شرف الدولہ نے رزیڈنٹ سے کہا کہ شاہی اہل کار مجھ سے بدگمان ہیں اور عداوت بھی رکھتے ہیں جس سے آپ بخوبی واقف ہیں۔ میں کہاں تک آپ کو تکلیف دوں گا نہ معلوم کس وقت نیا شگوفہ کھلا دیں جب تک مجھ سے وہ بدظن ہیں میں آپ کے پاس رہوں تو اچھا ہے۔ کچھ دن رزیڈنٹ کے پاس رہنے کے بعد اپنے گھر چلے گئے تھے۔ (۱۰۰)

ان ہی ایام میں رزیڈنٹ مسٹر سیلمن جن کے جانے کے لئے بڑے جتن کئے جاتے تھے، وظیفے پڑھوائے جاتے تھے، یہ ۵ اکتوبر ۱۸۵۴ء مطابق ۱۲ محرم ۱۲۷۰ھ کو رخصت پر چلے گئے، تو مرزا وصی علی خاں بلا اجازت نے رزیڈنٹ کے ۱۱ صفر ۱۲۷۰ھ مطابق ۳ نومبر ۱۸۵۴ء کو کاکوری سے لکھنؤ چلے

آئے اور وہیں رہنے لگے۔

جب واجد علی شاہ کو معزول کر کے کلکتہ بھیجنے کا پروگرام بن رہا تھا اس وقت واجد علی شاہ پر رزیڈنٹ اور ان کے حامی زور ڈال رہے تھے کہ حکومت کی دستبرداری اور نئے وظیفہ کی دستاویز پر دستخط کر دو۔ ان لوگوں میں شرف الدولہ بھی تھے، جنہوں نے واجد علی شاہ سے دستخط کرانے کی بیحد کوشش کی لیکن ناکام ہوئے۔

ان واقعات کے پیش نظر شرف الدولہ جن پر انگریزوں کے اس قدر احسانات ہوں، وہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں برجیس قدر اور حضرت محل کا ساتھ دے، یہ ناممکن ہے۔

شنبہ کے روز ۱۹ رجب ۱۲۷۳ھ مطابق ۱۲ مارچ ۱۸۵۷ء کو انگریزی فوج نے دل کشا سے پل باندھ کر دوسرے پار اتر کر جنوب کی جانب لوگوں نے مورچہ لگایا اور مجاہدین نے جنرل ہارٹن کی کوٹھی کے قریب اپنا مورچہ لگایا۔ اس وقت دکھاوے کے لئے نواب محمد ابراہیم ہاتھی پر سوار مع فوج کے حملہ آور ہوئے۔ ککراں پر مقابلہ ہوا۔ ایک بم کا گولہ نواب کے ہاتھی سے لگتا ہوا ایک رسالدار کے لگا جو فوراً ہی مر گیا۔ یہ منظر دیکھ کر نواب شرف الدولہ محمد ابراہیم خاں میدان جنگ میں نہیں ٹکے رسید ھا گھر کا رخ کیا۔ ان کی بزدلی اور فراری سے فوج میں بھگدڑ مچ گئی۔

احمد اللہ شاہ صاحب چکلا ولی کی کوٹھی میں مقیم تھے، انھوں نے وہاں سے نکل کر ککراں پر مورچہ لگایا اور مجاہدین سے مخاطب ہوئے کہ، "نواب شرف الدولہ محمد ابراہیم انگریزوں سے ملے ہوئے تھے اس لئے میدان جنگ سے بھاگ گئے جس کی وجہ سے فوجوں کے پاؤں اکھڑ گئے، اب تمہیں لازم ہے مورچہ پر ڈٹ جانا

چونکہ اب شام ہوگئی ہے مورچہ لگانے کا وقت نہیں رہا کل ہم جنگ کریں گے جس کو ہمارا ساتھ دینا ہو وہ رہ جائے اور جس کو ساتھ نہیں دینا ہے وہ چلا جائے۔ چنانچہ جب دو پلٹنیں تیار ہوگئیں تو ان سے فرار نہ ہونے اور استقلال کے ساتھ لڑنے کی قسم لی گئی۔

جب نواب شرف الدولہ جیسے ذمہ دار ساتھی غداری کر رہے تھے تو ایسی جنگ کا انجام اچھا کیسے ہو سکتا تھا۔ چنانچہ برجیس قدر، حضرت محل اور احمد اللہ شاہ صاحب کو جب ناکامی کا موہنہ دیکھنا پڑا تو حضرت محل صاحبہ اور برجیس قدر کو جنگ سے دستبردار ہو گئے۔ چنانچہ جب حضرت محل قیصر باغ سے نکلیں تو ان کے ہمراہ برجیس قدر اور دوسرے لوگ تھے، ٹیلہ شاہ خلیل سے گذر کر مولوی گنج پہنچے جواہر علی خاں نے اپنی پینس اور کہار دیئے، اس میں برجیس قدر اور حضرت محل صاحبہ بیٹھیں، تلنگے ان کے ہمراہ ہوئے، یحییٰ گنج، نخاس چوک ہو کر بغلی دروازہ میں غلام رضا خاں کے گھر میں اتریں، غلام رضا خاں نے انگریزوں کے آنے کے اندیشہ کا اظہار کیا تو شرف الدولہ کے مکان میں پہنچیں، یہاں ان کو یہ خیال پیدا ہوا کہ نواب انگریزوں سے مل کر گرفتار نہ کرا دے، اس لئے محل سرائے حسین آباد میں منتقل ہوئیں۔[1]

بالآخر ساتھیوں کے مجبور کرنے پر، ۲ رجب ۱۲۷۳ھ کو حضرت محل صاحبہ شرف الدولہ کے گھر میں اتریں۔ شرف الدولہ سے کہا تم بھی میرے ساتھ چلو اب کوئی صورت ٹھہرنے کی نہیں ہے۔ نواب شرف الدولہ نے ٹالنے کے لئے کہا،

[1] تواریخ اودھ ص ۳۳۳

"آپ جائیے غلام بھی فوج جمع کر کے حاضر ہوتا ہے"

نواب شرف الدولہ کے اقربا اور مقربین نے نواب صاحب سے کہا کہ ایسے نازک وقت میں یہ عذر لنگ کیوں کیا؟ نواب صاحب نے جواب دیا۔[1]

"فوج باغی کا ہر شخص مجھے متوسل سرکار جانتا ہے اور ارکان دولت کی بھی منافقت کا حال ظاہر ہے۔ بس یہی حیلہ سازش ان بیباکوں کے واسطے کافی ہے۔ میرے نزدیک اپنے گھر میں رہنا بہتر ہے۔ میرا جانا باعث ثبوت حق بجانب ہو جائے گا۔ اور اگر میں چلا جاتا دوستی اور خیر خواہی باغیوں کی ثابت ہوتی"

اسی رات کو محل سرائے کی کوٹھی پر بم گرا۔ انگریزی فوج گولہ باری بے تحاشہ کر رہی تھی۔ نواب شرف الدولہ بہت پریشان ہوئے کہ گھر بھی نہیں بچا۔ خاندان کو اپنے ہمراہ لیکر گلیوں سے ہوتے ہوئے شاہ گنج میں میر معین الدین کے گھر آئے۔ یہاں حسن خاں قمر الدولہ کے بیٹے کو بلوا کر نواب نے کہا کہ داروغہ عاشق علی سے جا کر کہو ـــــ اپنے اقربا کے ساتھ ہمارے لواحقین کو بھی لے جائیں ـــــ حسن خاں نے کہا۔ آپ عاشق علی کے مزاج سے واقف ہیں آپ کے جائے بغیر وہ توجہ نہیں دے گا۔

نواب صاحب حسن خاں کے ہمراہ کشمیری محلہ سے ہوتے ہوئے جب چوراہے پر پہنچے تو صبح صادق ہو چکی تھی۔ اس وقت اتفاقاً درگاہ حضرت عباس کی طرف سے کئی تلنگے آ رہے تھے وہ نواب صاحب کے برابر سے گذرے تو ان کی ہیئت کذائی

[1] قیصر التواریخ ص ۳۵۵۔

دیکھ کر کہنے لگے کہ یہ گویندہ یعنی جاسوس ہے کہیں مخبری کرنے کے لئے جا رہا ہے۔ نواب صاحب یہ سنتے ہی تیز قدم چلنے لگے۔ ان کو اور شبہ ہوا ایک تلنگے نے ان پر فیر کیا۔ نواب صاحب زمین پر لیٹ گئے۔ اس کے بعد رفیق الدولہ کی حویلی کے بند دروازے سے جا کر لپٹ گئے۔ کرانال کا پنچہ ہاتھ میں تھا چلایا اس نے صحیح کام نہ کیا تو اس کو پھینکدیا۔ سر پر جو چادر اوڑھے ہوئے تھے وہ گر گئی۔ تلنگوں نے انہیں شناخت کر لیا اور کہا یہ تو نواب صاحب ہیں۔ پکڑ کر موتی باغ میں احمد اللہ شاہ صاحب کے پاس لے گئے۔ انہوں نے ان کو ایک چھوٹے سے ٹٹو پر سوار کیا۔ وہ ٹٹو ان کا بوجھ برداشت نہیں کر سکا تو توپ کی پیٹی پر بٹھا کر ان کو اپنے ہمراہ درگاہ لائے۔

ایک روایت ہے جو بالکل غلط اور ناقابل اعتبار ہے کہ احمد اللہ شاہ صاحب نے ان سے ایک لاکھ روپیہ مانگا کہ یہ تم دیدو گے تو تم کو چھوڑ دیں گے۔ نواب صاحب نے کہا۔ میں دو لاکھ روپے دوں گا تم میرے ہمراہ ایک آدمی کر دو۔ شاہ صاحب نے کہا۔ تو خیر خواہ نصاریٰ ہے اب بھی ان کی حمایت سے ہاتھ نہیں اٹھانا جانتا ہے گورے سارے شہر میں پھیل گئے ہیں، اپنے ہمراہ میرے آدمی کو لیجا کر ان سے کٹوا دے گا اور خود بچ جائے گا۔ نواب نے جواب دیا کہ میں مجبور ہوں تمہیں اختیار ہے۔

جب ۲ شعبان ۱۲۷۴ھ کو کارنگی صاحب فوج کے ہمراہ درگاہ میں داخل ہوئے اور شاہ صاحب وہاں سے جانے لگے تو اس وقت نواب کے سر پر دو تلنگے تلوار لئے کھڑے تھے۔ انہوں نے نواب صاحب کے بارے میں پوچھا

کیا حکم ہے۔ انہوں نے فرمایا، مار ڈالو۔ ایک نے بندوق دوسرے نے تلوار ماری یہ ختم ہو گئے۔ اس عرصہ میں کارنیگی صاحب آ گئے۔ عنایت علی سے پوچھا کہ کس کی نعش ہے۔ جواب دیا نواب شرف الدولہ محمد ابراہیم صاحب کی۔ کہا لاشوں کو اٹھا کر صاف کر دو۔ غرض باورچی خانہ درگاہ کے ایک گڑھے میں مع اور نعشوں کے ان کی نعش بھی پیوند خاک کر دی گئی۔

جب لکھنؤ مکمل طور پر فتح ہو گیا تو ولیم صاحب نے نواب صاحب کے بیٹوں کو بلوایا اور کہا تمہارا باپ متوسل سرکار تھا رسل و رسائل کیوں موقوف کر دیا تھا۔[۵۱] بیٹوں نے جواب دیا اگر ان ہی سے جواب طلب کیا جاتا تو جواب شافی ملتا ہم کیا بتا سکتے ہیں۔ نواب شرف الدولہ کی شہری املاک اور ایک امام باڑہ ان کے خاندان والوں کو ملا۔

نواب شرف الدولہ کی وفات پر دیا کرشن صاحب ریحاںؔ لکھنوی[۵۲] نے حسب ذیل شعر کہا تھا۔ ؎

بے گور و کفن رہی جو لاش اس کی سر دشت　　بولا کہ وہ سب شرف ملا مٹی میں

---

۵۱ قیصر التواریخ ص ۳۵۷۔

۵۲ دیوان دیا کرشن ریحاںؔ لکھنوی کے والد منشی گنگا بشن عزیزؔ تھے سری باستب کایستھ تھے شاہ آباد ان کا اصل وطن تھا مگر کافی عرصہ سے لکھنؤ میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ منشی موجی رام موجیؔ سے پہلے استفادہ کیا پھر منشی جواہر سنگھ جوہرؔ سے مشورہ لینے لگے۔ سلطان واجد علی شاہ کے دور حکومت میں بخشی الممالک داتی ص ۶۴ پر

دوسرا قطعہ تاریخ فتح بہادر علی شجاعؔ نے حسب ذیل کہا ہے :-

شرف الدولہ فلک مرتبہ ہمنام خلیل	صاحب خلق و حیا منصف و فیاض و حلیم
چوں بدرگاہ ضیا بار جناب عباس	شد قتیل ستم لشکر غدار و لئیم
ماند بے گور و کفن جسم شریفش بر خاک	شد رواں روح لطیفش سوئے فردوس نعیم
آرے آرے شہدا راز عنایات خدا	کفن از حلہ بود غسل ز آب تسنیم

(بقیہ حاشیہ صـ۶۳) راجہ الفت رائے کے سررشتہ دار تھے۔ سلطنت کے زوال کے بعد پنڈت شیو دین وکیل کے ملازم ہو گئے تھے۔

جناب ریحاں بڑے وضعدار، خوددار، اس کے ساتھ نازک مزاج بھی تھے۔ علمی قابلیت اور خاندانی وجاہت میں جواب نہیں رکھتے تھے۔ بڑے بڑے باکمال اور مشہور اہل علم حضرات کے صحبت یافتہ تھے۔ شعر کے فن کے تمام رموز پر قادر تھے۔ عاشقانہ طبیعت کے مالک تھے۔ شیریں کلامی، معنی آفرینی آپ کے کلام کا خاص رنگ ہے۔ زبان بہت پاکیزہ، صاف و ستھری، سلیس و فصیح ہے۔ شیخ ناسخ کی طرح آپ کے کلام میں خشکی اور بے تاثیری نہیں بلکہ پر کشش اور انتہائی موثر ہے۔ آپ کی زندگی میں ہی آپ کا کلام زبان زد خاص و عام ہو گیا تھا۔

واجد علی شاہ کی سلطنت کے چلے جانے کے بعد جناب ریحاںؔ کو فارغ البالی اور آسودگی کبھی حاصل نہیں ہوئی۔ واجد علی شاہ کے بڑے مداح اور سچے عاشق تھے۔ اسی بنا پر جناب خلیلؔ کے قتل ہونے پر مذکورہ شعر انہوں نے کہا تھا۔ چنانچہ واجد علی شاہ کو دوبارہ سلطنت مل جائے، اس کے لئے (باقی صـ۶۵ پر)

زمزم کعبہ ازیں واقعہ شد چشم پر آب　　پشت محراب دوتا گشت ازیں ریخ عظیم

بدل چاک رقم کردہ شجاعت تاریخ

شد سیہ پوش حرم از الم ابراہیم

نواب شرف الدولہ نواب عاشور علی خاں کے شاگرد تھے۔ کبھی کبھی شعر کہتے تھے اور اچھا کہتے تھے۔ ؎

میرے گھر کا ہیکو آپ آئیے گا　　خیر بندے ہی کو بلوائیے گا

سن کے حال شبِ فرقت بولے　　کہیے کچھ اور بھی فرمائیے گا

(بقیہ حاشیہ ص۶۴) ہمیشہ دعا کرتے رہے۔ کتنا محبت بھرا شعر ہے۔ ؎

ملے ملکِ اودھ واجد علی سلطاں کو اے ریحاں

خدا چمکائے پھر اک دن ستارہ میرے اختر کا

جناب ریحاںؔ صاحب دیوان تھے۔ ان کے دیوان کا نام "باغ ریحاں" ہے۔ ان کی قادر الکلامی کا اکثر غزلوں اور اشعار میں ثبوت ملتا ہے۔ ؎

خدا کے ہاتھ ہے انصاف اے بتِ بے رحم　　ہمارے صبر کا اور تیرے دل دکھانے کا

کیا کہوں بھول گیا ورنہ خدا سے کہتا　　مجھ کو دیوانہ نہ کر اس کو پریزادنہ کر

بشر کی صورت و سیرت دیکھنے والا　　نظر پڑا ہمیں لاکھوں میں کوئی انساں ایک

بد بھی کرتا ہے نیکی اپنے ساتھ　　جب کہ دن بہتری کے ہوتے ہیں

اب بھی ہم سے غبار باقی ہے　　قبر کو پائمال کرتے ہو

خرد کہتی ہے کیا نا قدر داں سے مل کے پاؤ گے　　محبت کہتی ہے دیکھوں ہیں تم کیونکر نہ جاؤ گے

ایسے ہی وعدے وفا ہوتے ہیں — ہاں بجا سچ ہے ضرور آئیے گا

کھیل میں جان پر کھلوائے گا — ہم کو شمشیر سے سر آئیے گا

نزع میں دیکھ کے فرماتے ہیں — ہم جلائیں گے جو مر جائیے گا

وصل میں کہتے ہیں بھولے بن کے — کس طرح ہجر میں مر جائیے گا

کس عنایت سے وہ کہتے ہیں خلیقؔ
شام کو آج ضرور آئیے گا

ہے موجِ تبسم لبِ مے نوش پر انگشت — ایسا نہ ہوا اٹھے خرد و ہوش پر انگشت

مثلِ مہِ نو عشق میں اس رشکِ قمر کے — اٹھتی ہے سدا مجھ سے وفا کوش پر انگشت

پوریں ہوں قلم اس کی سرِ دست سزا ہے — اٹھے جو حسد سے تری پاپوش پر انگشت

لاغر ہوں نہ آزار کہیں شانے کو پہنچے — رکھے عوض دستِ کرم دوش پر انگشت

کیا طالبِ بوسہ ہوں وہ ہیں شرم مجسم — چپ کا ہے اشارہ لبِ خاموش پر انگشت

بد عہد ہوا ہم سے تو ہر ایک بشر کی — اٹھنے لگی اس عہد فراموش پر انگشت

فوارہ خوں چھٹتے ہیں اور کان نزاکت — استاد جو رکھتا ہے بناگوش پر انگشت

ہے عین رضا وصل کی اس طرح سے ثابت — رکھے جو وہ گل نرگسِ مدہوش پر انگشت

کس طرح خلیقؔ اب کروں وصفِ صراحی
ہے ہر خطِ ساغر لبِ مے نوش پر انگشت

مثلِ تدرو سرخ ہیں اس سیمتن کے پاؤں — یا لالۂ شگفتہ ہیں رشکِ چمن کے پاؤں

ہاتھوں پہ سر جو معرکۂ امتحاں میں تھا — پیچھے ہٹے نہ ایک قدم کوہکن کے پاؤں

دیکھی قریبِ چشم جو گیسوئے مشکبار — تشبیہ دی کہ ہیں یہ غزالِ ختن کے پاؤں

پہنچا ہوں ایسی وادیٔ غربت میں اے جنوں
ٹوٹے مری تلاش میں اہلِ وطن کے پاؤں

سروِ چمن کے نیچے گلِ لالہ دیکھ کر
یاد آ گئے حنائی کسی گلبدن کے پاؤں

لیجاتی آپ لاشۂ پروانہ گور تک
اے اہلِ بزم ہوتے جو شمعِ لگن کے پاؤں

دیوانہ تیرا بادیہ پیما ہوا، اگر
دوڑے گا اس کے لینے کو خود قیس بن کے پاؤں

درگاہ میں خدا کی، دعا ہے یہ اے خلیلؔ
ہوں روزِ حشر سر پہ مرے پنجتن کے پاؤں

••

داور

میر داور علی داور مارہروی

میر داور علی داور اناؤ کے قدیم باشندے تھے اور ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں انہوں نے مجاہدین کا مقابلہ کیا۔ جنگ آزادی کو ناکام کرنے کی کوشش کی۔ اور مجاہدین کی مخبری کر کے ان کو پھانسی پر چڑھوایا۔ داور صاحب ان ہی ایام میں تحصیلدار تھے۔ جنگ آزادی کے بعد حکومت برطانیہ کی خیر خواہی کے صلہ میں ڈپٹی کلکٹر ہوئے اور موضع سلیم پوران کو انعام میں ملا۔ اس کے بعد انہوں نے کچھ دیہات ایٹہ میں خریدے اور مارہرہ کو پسند کر کے اس میں رہائش اختیار کی۔

میر داور علی صاحب ۱۸۹۶ء تک پنشن پاتے رہے[1]۔ ان کے پوتے منشی سید امیر حسن مارہروی شاعر تھے۔ داغ کے شاگرد تھے۔ دلیر تخلص تھا۔ ۱۸۶۷ء

[1] خم خانہ جاوید سوئم ص ۲۰۵۔

مطابق ۱۲۸۹ھ میں پیدا ہوئے تھے۔ داور صاحب کا کلام دستیاب نہیں ہو سکا ان کے پوتے کے دو شعر ملاحظہ کیجئے۔ ؎

کہیں تم، کہیں ہم، یہ اندھیر کیا ہے
مرادوں کے دن اور یوں جا رہے ہیں

کیا ضرورت تھی جو یہ زحمت گوارا کی گئی
کیوں مجھے ناپید ہونے کے لئے پیدا کیا

••

راجہ

مہاراجہ سروگ بجے سنگھ بلرامپوری

مہاراجہ سروگ بجے سنگھ والیٔ بلرام پور وتلسی پور قوم کے جوار راجپوتوں سے تعلق رکھتے تھے۔ گجرات وچمپانیر سے ان کے آباؤ اجداد آکر یہاں کے علاقہ جات پر شمشیر وطاقت اور قوت کے نندر سے قابض ومالک ہوئے۔ عہد تاج الدین میں بادشاہ نے ان کے بزرگوں کو علاقہ بہرائچ آبادی وکاشت کے لئے دیا تھا۔ اکونہ کا قصبہ انہوں نے بسایا جس سے ریاست کی بنیاد پڑی۔ اٹھارہ راجے راجہ نرائن سنگھ برادر سر راجہ کے زمانہ تک حکمراں رہے۔ آبائی زمینداری پر مسند نشینی کے وقت مہاراجہ صاحب اٹھارہ سال کے تھے۔ راجہ محمد خاں تعلقدار اترولہ ان پر حملہ کرنے کا ارادہ رکھتا تھا کہ یہ خود اس سے جاکر نبرد آزما ہوئے اور اس کی گڑھی کو لوٹ لیا۔ سمت ۱۸۹۷ کو شاہ اودھ کی جانب سے راجہ درشن سنگھ ناظم بنائے گئے انہیں مہاراجہ سے پرخاش تھی انہوں نے ان کے نائب گجادر سنگھ سے تہدید کے

ذریعہ بلرام پور خالی کرالیا تھا۔ ان ایام میں مہاراجہ اپنی شادی کرنے بانسی گئے ہوئے تھے۔ یہ واقعہ سن کر بہت رنجیدہ ہوئے۔ یہاں نہیں ٹھہرے بلکہ نیپال چلے گئے۔ وہاں مہاراجہ جنگ بہادر نے انہیں بڑی عزت و توقیر کے ساتھ رکھا اور اعانت کا یقین دلایا۔ نیپال کے رزیڈنٹ کے زور دینے پر شاہ اودھ نے درشن سنگھ کو معزول کر دیا تھا اور مہاراجہ دوبارہ اپنے علاقہ کے مالک بن گئے تھے۔

سنہ ۱۹۰۵ میں راجہ دگراج سنگھ والی ملتی پور کوان کے صاحبزادے دگ نرائن سنگھ نے معزول کر دیا۔ واجد علی شاہ کے حکم سے مہاراجہ نے ان کی اعانت و مدد کر کے دگ راج سنگھ کو دوبارہ قبضہ دلایا۔ اسی طرح مختلف جنگوں اور معرکوں میں مہاراجہ نے اپنی بہادری و دلیری و شجاعت کے جوہر دکھائے۔

۱۸۵۶ء میں جبکہ اودھ کی حکومت پر انگریزوں نے قبضہ کر لیا تھا۔ اس کے خلاف آواز اٹھانے کے بجائے یہ فوراً چارلس ونگ فیلڈ کمشنر بہرائچ کے پاس پہنچے اور یقین دلایا کہ ہم آپ کے ساتھ ہیں اور علاقہ بھی آپ کا ہے۔

جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کا آغاز ہوا تو ان کو کمشنر نے لکھا کہ پانچ فوجی ہماری امداد کے لئے بھیجو۔ انہوں نے فوراً حکم کی تعمیل کی۔ قلعہ ٹوہاں پر قبضہ کرنے کے لئے مجاہدین سے مقابلہ کیا اور بیدردی کے ساتھ ان پر ظلم کئے اور قتل کیا جب کہیں جا کر قلعہ پر قابض ہوئے۔ [1]

[1] خم خانۂ جاوید سوم صہ ۳۰۵۔

۱۸۵۸ء میں انگریزی حکومت نے جب دوبارہ گونڈا فتح کیا تو مہاراجہ افسروں کے پاس گئے۔ تلسی پور اور بانسی کے راجوں نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں حصہ لیا تھا اور طوق غلامی پاش پاش کرنا چاہتے تھے۔ جب ان کو شکست ہوئی تو ان کے علاقہ بھی انعام کی صورت اور خیر خواہی اور وفاداری کرنے کی وجہ سے ان کو ملے۔ اور ۱۸۵۹ء کے لکھنؤ کے دربار میں اول نمبر کی کرسی ان کو ملی۔ اور سات ہزار کا خلعت اور مہاراجہ بہادر کا خطاب عطا ہوا۔ اور اختیارات دیوانی و کلکٹری ان کو ملے۔ وائسرائے کی کونسل کی ممبری کا اعزاز بھی ان کو حاصل ہوا۔ یہ تمام ملکی مہموں میں انگریزی حاکموں کے قابل اعتماد اور لائق بھروسہ مشیر مانے جاتے تھے۔

یہ اودھ کے تعلق داروں میں اپنی الوقتی کی وجہ سے دور اندیش، نکتہ رس مانے جاتے تھے۔ لکھنؤ کی حکومت کے مٹنے کے بعد پرانے رئیسوں کے خاندانوں کی پرورش آپ کے ہاتھوں ہوئی۔

شعر و شاعری سے بھی مہاراجہ کو لگاؤ تھا۔ منشی جواہر سنگھ جوہر شاگردِ خواجہ وزیر کے آپ شاگرد تھے۔ شکار کا بیحد شوق تھا کافی وقت اس میں لگاتے تھے۔

۱۸۸۴ء میں مہاراجہ نے انتقال کیا۔ ان کی زندگی میں ان کے صاحبزادے مر گئے تھے۔ آپ کی سرپرستی میں احسن التواریخ وغیرہ کتابیں بھی شائع ہوئیں۔ اشعار کبھی کبھی کہدیا کرتے تھے۔ کلام میں فصاحت و بلاغت ہے۔ صاحبِ دیوان تھے۔ ۵

صغر سن میں بہت ہو بھولوں کے نثار
تم ابھی اے جانِ من خود بھول ہو

خواب مخمل جن گل اندا موں کو فرشِ خار تھا
موت نے تربت میں ان کو خاک بستر کر دیا

حسن سے عشق نہ ہو جس کو وہ انساں کیسا
منکر قدرت حق صاحبِ ایماں کیسا

روشنی ہے عاشقوں کے دم سے باغ دہر میں
بلبلوں کو اے گلو سمجھو گلستاں میں چراغ

پامال آج وہ ہیں جو کل تک نہال تھے
کھلتا نیا ہے روز تری انجمن میں گل

تیری صورت دیکھ کر لیلیٰ کو آئے گا حجاب
میری صورت دیکھ کر مجنوں بہت شرمائے گا

گئے وہ دن کہ حسینوں کو پیار کرتے تھے
نہ ولولے رہے اپنے نہ وہ شباب رہا

خم کھلے، شیشے کھلے، میکدہ کا در کھلا
مغبچہ ہم پر نہ مضمونِ خطِ ساغر کھلا

یار کے پاس اڑ کے چلا جائے گا نامہ
اب تو خود سیکھ گیا کار پیمبر نامہ

یاد آئی جو اس کی جنت میں
حور کو دھیان میں نہ لائیں گے ہم

بے یار کیا بیاں ہو تقریرِ خواب کی
یوسف سے چل کے پوچھئے تعبیر خولب کی

بال کھولے ہیں کس نے چوٹی کے
کیا پریشان دن گذرتے ہیں

گیا صحبت میں جب بے مفسدوں کی
مزاجِ اصلاح پر آیا نہ اس کا

آپ ہی آپ کچھ اغیار جلے مرتے ہیں
خود بخود اب جو ہوا آپ کو ہم سے اخلاص

اے صبا ہے کس عارض کا انہیں بھی سودا
باغ میں ہوتے ہیں گل چاک گریباں پیدا

کس طرح ہم نہ ہوئے اس ابروئے خمدار سے خوش
جو دلاور ہیں سدا رہتے ہیں تلوار سے خوش

اللہ غنی حسن پہ کس درجہ ہے مغرور
وہ اپنا کبھی پاؤں زمیں پر نہیں رکھتا

ہے نمودِ سبزۂ خطِ عارضِ جاناں کے پاس
آئے خضر تشنہ لب یاں چشمۂ حیواں کے پاس

راجہ بھلا ہے دزدِ حنائی کا کیا قصور
دل اپنا اپنے ہاتھ سے خود ہم نے کھو دیا

دل بیچنے کھڑے ہیں ترے گھر کی راہ پر ارزاں ہے مول لے جو اسے اک نگاہ پر

عشق میں تیرے ہوا ہے اے صنم ایک مذہب کا فرو دیندار کا

انساں چلے وہ چال کہ جو ہو جہاں پسند مہماں سے ہو وہ کام جو ہو میزباں پسند

رنج و غم دل کو مرے دیتے یہ تو سمجھو ہم نے کس ناز و نعم سے اسے پالا ہو گا

کیا تلون ہے مزاجِ یار میں شام کو اقرار تو انکار صبح

ہم جو گھر اس کے لگے جانے شبِ تاریک میں شعلۂ دل آگے آگے مثلِ مشعل ہو گیا

محتسب ٹوٹیں گے ساتھ اس کے کبھی کا سر سن لے رندوں پہ بہت کچھ ہے حقِ جامِ شراب

مجھے بھی ہر گھڑی کی بدمزاجی خوش نہیں آتی کہوں گا پھر جو میں کچھ طبعِ نازک پر گراں ہو گا

دیکھ کر لیلی کو یہ خوش ہو کے مجنوں نے کہا دو گھڑی دم سے ترے جنگل میں منگل ہو گیا

جیسی کہو گے ہم کو ویسی سنو گے ہم سے کب چپ رہے گا وہ جو حاضر جواب ہو گا

اپنی نظر بھی اکثر انساں کو لگی ہے آئینہ میں نہ دیکھو منہ بار بار اپنا

نام مشہور ہمارا رشکِ مسیحا راجہ!

پر نہیں فکرِ علاجِ دلِ بیمار ہے کب

••

سروری

نواب محمد کاظم علی خاں رامپوری

نواب محمد کاظم عرف چھوٹے صاحب جناب نواب محمد سعید خاں والیٔ رامپور کے صاحبزادے اور نواب یوسف علی خاں والیٔ رامپور کے حقیقی بھائی تھے۔ ان دونوں بھائیوں میں آپس میں بہت محبت اور اتحاد تھا۔ نواب کاظم علی خاں علوم متداولہ میں بڑی استعداد رکھتے تھے۔

جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کی ابتدا میں انہوں نے بھائی کی پرواہ نہ کرتے ہوئے مقام بھابھر میں انگریزوں سے مقابلہ کیا اور ان کو نقصان پہنچایا اور مجاہدین کا ساتھ دیا۔ لیکن اس کے بعد اپنے بھائی نواب یوسف علی خاں کے کہنے پر انہوں نے انگریزوں کا ساتھ دینا شروع کیا۔ نوابی فوج کی اعانت کرنے لگے اور مجاہدین کے خون کے پیاسے بن گئے۔

جب ۲۳ اپریل ۱۸۵۸ء کو رام گنگا کے کنارے فیروز شاہ سے مقابلہ ہوا اور

مجاہدین نے شاہ بلاقی کے نزدیک مورچے لگائے تو نواب یوسف علی خاں کی فوج نے بھی اپنا مورچہ لگایا اور کل ڈویژن کے تین حصے کئے۔ ایک حصہ خاکی ڈویژن کا تھا جس میں صاحبزادہ سید کاظم علی خاں کی فوج بھی شامل تھی اس نے قلعہ کے محاذی اپنا مورچہ لگایا۔ ۲۴ اپریل ۱۸۵۸ء کو صبح خاکی ڈویژن نے مجاہدین پر گولے برسانے شروع کئے جس میں نوابی فوج کو شکست کھانی پڑی بعد میں دوبارہ مورچہ لگا۔ اس معرکہ میں فیروز شاہ کو شکست ہوئی اور مجاہدین کافی تعداد میں شہید ہوئے۔ اس وقت صاحبزادہ سید کاظم علی خاں کے ہمراہ ریاست کی فوج چکر کے میدان میں ٹھہری۔ ؎

جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کی ناکامی کے بعد گورنمنٹ ہند نے چٹھی مورخہ ۷ار دسمبر ۱۸۵۹ء میں نواب محمد کاظم کا شکریہ ادا کیا کہ رامپور اور دوسری سڑکوں کا انہوں نے مئی ۱۸۵۷ء میں بندوبست کیا گویا مجاہدوں کو باغیانہ کارروائی کرنے سے روکا۔ نواب یوسف علی خاں نے ان کو جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کی خیر خواہی کے صلہ میں دو لاکھ روپے مرحمت کئے۔ (۱۱۳)

نواب یوسف علی خاں نے سید کاظم علی خاں کو اپنی حکومت کے کافی اختیارات دے رکھے تھے۔ کاظم علی خاں انتہائی منتظم و تجربہ کار تھے، انہوں نے ریاست کے انتظامات میں تغیر و تبدل اور اصلاح کی جس سے حکومت اور عوام کو فائدہ پہنچا۔ مثلاً ـــــ

(۱) اہل ہنود کے مقدمات دیوانی دھرم شاستر کے مطابق کئے جانے

؎ اخبار الصنادید دوم ص۳۸۔

کا حکم دیا۔

(۲) ۱۸۶۳ء میں جب خطرناک قحط پڑا تھا، روزانہ خیرات تقسیم کرنے کا حکم دیا۔

(۳) پولیس کے ملازموں کی وردی غیر ملازم بھی پہن لیا کرتے تھے، ان کی ممانعت کرائی اور پولیس کے ملازمین کے لئے تخصیص کی۔

(۴) اشتہار جاری کیا کہ کوئی شخص ہتھیار بند طوائف کے کوٹھوں پر نہ جائے۔ اگر جائے تو طوائف کو رپٹ لکھوانی چاہیے۔

نواب یوسف علی خاں کے انتقال کے بعد نواب کلب علی خاں مسند نشین ہوئے۔ تو ان کی منداتہاں نے پلٹا کھایا۔ نواب صاحب نے کچھ دنوں ظاہرا طور پر ان کے ساتھ اچھا سلوک کیا۔ لیکن جب مسند نشینی میں کوئی خدشہ وخطرہ باقی نہیں رہا تو توجہ ہی نہیں ہٹائی بلکہ علیحدہ کرنے کے طریقے اختیار کرنے شروع کر دیئے۔ ان کے پاس نواب یوسف علی خاں کے زمانہ سے سپاہیوں کے لئے جو اسلحہ رہتے تھے، ان کو ان کے ہاں سے منگا لیا۔ جب انہوں نے یہ طور طریقے دیکھے تو نواب کلب علی خاں کو اطلاع دیئے بغیر بریلی چلے گئے۔ ان کے باغات و مکانات کو کافی نقصان پہنچا۔ نواب مشتاق علی خاں کے عہد ۱۸۸۶ء کے درمیان ان کا انتقال ہوا۔ (۱۳۸)

نواب کاظم علی خاں انتہائی سخی تھے۔ انتخاب یادگار کی تالیف کے وقت ان کی ساٹھ سال کی عمر تھی۔ کبھی کبھی نظم بھی کہہ لیا کرتے تھے۔ دو مادہ تاریخ اور ایک قطعہ فارسی آپ کی یادگار ہے۔ [۱]

[۱] انتخاب یادگار ص ۱۷۱۔

یکن از ظہر جناب نواب ۱۲۲۰ سرطان ۳۲۰ دور دہیفزائے شفا ۳۸۱

اس تاریخ کا یہ حل ہے کہ اعداد حروف ظہر کہ جناب نواب ہے کہ مجموعہ بارہ سو بیس ہوتے ہیں، لفظ سرطان کے اعداد تین سو بیس ہیں، ساقط کئے جائیں، تو نوسو رہ جائیں گے۔ ان نو سو پر اعداد لفظ شفا کے تین سو اکاسی ہیں بڑھائے جائیں تو پورے بارہ سو اکاسی ہجری ہوں گے۔

ملفوظی و معنوی نوشتہ توام ہشتاد و چہار و یک ہزار و صد

۱۲۸۴ھ

قدردانی ہائے سلطاں طرز مضموں آفرید خار را گل کرد و خس را شش طوبیٰ برگزید

برگ شد برگ گل خورشید کاہی کہکشاں ہر ذرہ قطرہ گوہر گشت از بخت سعید

پارہ چوبی خشک و بے جوہر کہ کردم پیشکش از رہ جوہر شناسی با بشاد ابی رسید

در ستایش قطعہ آمد چو باغ دل کشا بہر قفل غنچۂ خاطر بدست آمد کلید

چند نظمی کہ اعجاز ست یا سحر حلال کز سراپایش عذوبت ہا بکام جاں چکید

خواندن آں در تن ہر کس کہ جان نو دہد اتفاقاً گر بمیرد زندہ ماند چوں شہید

معنی او عرش پیوند ست از قرب خدا سلک نظم آبدارش رشتۂ حبل الورید

سطر سنبل نقطہ ریحاں لفظ گل بیتش چمن رفت چوب کہنہ زاں سو گلستانی رسید

مصرع ہر شعر در پہلوی مصراع دگر ہم بغل چوں مومناں بعد نماز روز عید

ہمچو ... بزم صوفیاں قرطاس لبریز صفا پیر باشد مطلع و ہر بیت باشد چوں مرید

وہ چہ خط خوش کہ پیش دیدۂ اہل نظر خوشتر و زیبا ست مثل قطعۂ آغا رشید

وقت نظارہ تماشائی گلستاں در نگاہ خوش ثمر آورد نخل آرزوئے اہل دید

ہر کہ در بزمش زراہ کبر زد لافِ سخن — پردہ گوشِ سخن سبحان وحلق خود درید

پیش نظم عالیش آیا چہ باشد نظم من — آں زحاتم نعمت دانیست توشہ از فرید

لنگ باشد اسپ طبعم پیش اسپ طبع او — در طریق شہسوار یہا عناں باید کشید

مختصر باید سخن کردن خبردار ای زباں — دست بالا کن کہ ہنگام دعایش دررسید

دوستانش سبز چوں در خلد اصحاب حسین

دشمنانش کندہ دوزخ چو یاران یزید

••

رحیق

وجیہ الزماں بجنوری

مولوی وجیہ الزماں صدیقی ابن شیخ محمد منعم الزماں خاں صاحب قصبہ فرخ آباد عرف چلاداں ضلع بجنور کے کریم النفس بزرگ تھے۔ مقدس لوگوں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ فارسی و عربی میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ ید طولی حاصل تھا۔ کافی عرصہ محکمہ صدر آگرہ ہائیکورٹ میں سررشتہ دار رہے۔ [1]

نواب محمد سعید خاں صاحب آگرہ کے حالات اور وہاں کے اچھے بڑے ملازموں اور افسروں سے بخوبی واقفیت رکھتے تھے جب آپ مسند نشین ہوئے تو چند روز کے بعد آپ کو نواب محمد سعید خاں صاحب نے آگرہ سے طلب کیا۔ اور انگریزی حکومت اور ریاست کے اچھے تعلقات کو برقرار رکھنے اور خصوصاً انگریزوں کو ملک کے پورے حالات سے آگاہ کرنے کے لئے سفیر مامور کیا۔

[1] تذکرہ کاملاں رامپور صہ ۴۳۹۔

۱۸۵۷ء میں جناب رحیق نے دل کھول کے مخبری کی چنانچہ اس وفاداری ومخبری کے صلہ میں گویا بصلہ خدمات جنگ آزادی ۱۸۵۷ء ۱۵ نومبر ۱۸۵۹ء کو لارڈ کیننگ گورنر جنرل کل ہند نے دو ہزار روپیہ کا خلعت فتح گڈھ کے دربار میں دیا۔ اس کے برعکس آپ کے چھوٹے بھائی شیخ فریدالزماں اور ان کے بھتیجے جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں شریک ہوئے تھے اور بہادری وجوانمردی کے جوہر دکھائے تھے۔

مولوی وجیہ الزماں انتہائی پرہیزگار متقی و دیانتدار نہایت عابد و زاہد تھے برائی کا جواب برائی سے نہیں بلکہ بھلائی سے۔۔۔ دیتے تھے۔ نواب کلب علی خاں والئ رامپور نے اپنے مسند نشین ہونے کے ایک سال بعد آپ کو یکمشت چالیس ہزار روپے نقد دیئے۔

آپ چوہتر برس کی عمر میں ریاست رامپور میں ۲ جمادی الاول ۱۲۸۹ھ میں فوت ہوئے[1]۔ فکر سلیم اور ذہن رسا رکھتے تھے۔ کبھی کبھی کچھ شعر بھی کہہ لیا کرتے تھے۔ سہ

شکر خدا کہ وہ مجھے پہچانتے نہیں	محفل میں ان کی کاہیکو ہوتی جگہ نصیب
حسن کی فوج میں دیکھی ہیں زرہ پوش نئی	کرتیاں جالی کی پہنی ہیں حسینانِ جہاں
تحسین تو نکلی مرے قاتل کی زباں سے	کیوں کر نہ مروں اپنے تڑپنے پہ میں بسمل

رحیق از فرط بیتابی دل مجروح در پہلو
شب ہجر از طپیدن یک نفس ننشست و ننشیند

[1] انتخاب یادگار ص ۱۲۵۔

مولوی رفیق کے دو صاحبزادے مولوی فصیح الزماں فصیح اور محمد حلیم الزماں سرخوش شاعر تھے۔ فصیح ۱۸۵۶ء مطابق ۱۲۷۳ھ کو پیدا ہوئے۔ ۱۸۵۶ء میں بریلی سے اپنے والد کے ساتھ رامپور آئے۔ ابتدا میں گم صم رہتے تھے۔ پہلے حافظ نیاز محمد پنجابی رام پوری آپ کے پڑھانے پر لگائے گئے تھے۔ قرآن شریف اور کچھ اردو کی کتابیں پڑھیں، پھر مولوی سید احمد علی فرخ آبادی تعلیم پر مامور ہوئے۔ اس کے بعد مولوی عبداللہ تعلیم کے لئے بلائے گئے ان سے ہدایت النحو تک پڑھا۔ اسی زمانہ میں مجذوبیت کا غلبہ طاری ہوا لکھنا پڑھنا چھوڑ دیا حاجی عبدالقادر رام پوری سے بیعت ہوئے حالت درست ہوئی، پھر رات دن کتب بینی میں مشغول رہنے لگے تھے۔ مولوی مفتی ریاض الدین، مولوی مسیح الدین خاں کاکوری، مولانا سید حسین شاہ محدث اور مولوی مفتی سعد اللہ سے کتب درسیہ پڑھیں۔

نواب رام پور نے ان کے لئے سو روپیہ ماہانہ مقرر کر دیا تھا۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد فارسی کے پروفیسر مدرسۂ عالیہ کے مقرر ہوئے۔ شعر و شاعری سے بھی دل چسپی تھی۔ فارسی کا دیوان مکمل تھا تمام اقسام کے اشعار اس میں تھے مگر مرتب نہیں ہوا۔ اردو میں کبھی کبھی کہہ لیا کرتے تھے۔ حضرت امیر مینائی کے شاگرد تھے۔ ۴ جمادی الاول ۱۳۱۱ھ میں ۳۹ سال کی عمر میں فوت ہوئے اور جناب امیر شاہ کے قبرستان میں دفن ہوئے۔ اشعار دل چسپ ہوتے تھے۔ ؎

ہوں وہ بلبل کہ قفس میں جو چمن یاد آیا   ڈالیاں پھولوں کی لیکر وہیں صیاد آیا

تیرے حصہ میں عجب حسن خداداد آیا	آنکھ یوسف کی بھی پڑتی ہے تو للچائی ہوئی

کیا پوچھتے ہو شمع کے پروانے کیا ہوئے	صدقے ہوئے، فدا ہوئے جل کر فنا ہوئے

موسیٰ و برق طور انہیں کے ہیں دونوں نام
خودبیں ہوئے کہیں، کہیں خودنما ہوئے

جناب سرخوش نے بائیس برس کی عمر میں تمام علوم و فنون حاصل کرلئے تھے شعر گوئی میں بھی کمال حاصل کرلیا تھا۔ حضرت امیر مینائی سے مشورۂ سخن کرتے تھے۔ [1]

آ کر اسیر دام ہوئے ہم چمن کے پاس
بڑھ کر لیا قضا نے جو پہنچے وطن کے پاس

••

[1] انتخاب یادگار ص ۱۷۰

صوفی

منشی سید امتیاز علی کاکوری

منشی سید امتیاز علی صاحب صوفی کا سلسلہ نسب ماں باپ دونوں کی جانب سے سادات علوی سادات بنی فاطمہ سے ملتا ہے۔ ۱۸۳۵ء میں باندہ میں جہاں ان کے والد ماجد حکومت انگریزی میں ملازم تھے، وہاں پیدا ہوئے۔ اس زمانہ میں ریاست باندہ کا کافی عروج تھا۔ کافی سے زیادہ اہل علم وہاں جمع ہوگئے تھے۔ تعلیم منشی صاحب نے وہیں پائی۔ عربی و فارسی کی تعلیم کے فن سپہ گری میں بھی کمال پیدا کیا۔ جو اس دور میں ہر شریف آدمی ضرور سیکھتا تھا۔ تعلیم کے حاصل کرنے کے بعد منشی صاحب باندہ کے قریب ایک دوسری ریاست میں سو روپیہ ماہانہ پر ملازم ہوئے۔ فارسی انشار پردازی میں مرزا غالب اور نظم میں مولانا غلام امام شہید سے مستفید ہوتے تھے۔ شروع میں ان کا تخلص جمیل تھا۔ استاد کے حکم سے بعد میں صوفی تخلص بدلا۔ صوفی صاحب تخلص کے

لحاظ سے ہی نہیں بلکہ مجسم حسین و جمیل تھے۔ حسین صورت کے ساتھ سیرت میں بھی حسن و جمال تھا آپ خلیق، حلیم، سلیم، متواضع اور سچی طبیعت کے مالک تھے۔ ان کی گفتگو دلآویز، دل کش اور باتیں شگفتہ ہوتی تھیں۔ انتہائی سادہ مزاج تھے تصنع و بناوٹ سے نفرت کرتے تھے۔

اودھ کی سلطنت کے خاتمہ کے بعد مسٹر بارلو ڈپٹی کمشنر گونڈا نے ان کو طلب کیا اور پولیس افسر مقرر کیا اور زمانہ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء تک اسی عہدہ پر مامور رہے۔ مجاہدین کو کچلنے، جنگ آزادی کو ناکام بنانے کی کوشش کے صلہ میں ان کو حکومت برطانیہ سے انعامات بھی ملے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد ان کے والد نے پنشن لی تو ان کی جگہ پر منشی صاحب کا ہی تقرر ہوا۔ یہ بڑا پرآشوب زمانہ تھا۔ حالات بدل چکے تھے ریاست کی بساط الٹ پلٹ ہو چکی تھی باکمال حضرات نے ریاست کو خیرباد کہہ دیا تھا۔ ان حالات میں بھی منشی صاحب نے چھ برس باندہ میں گذارے۔ حالات زیادہ ناخوشگوار پائے تو مستعفی ہو گئے تھے۔ اس کے بعد قانونی تعلیم پائی جوڈیشنل کمشنری اودھ کا امتحان دیا۔ اول درجہ پاس ہوئے تو وکالت شروع کی۔

منشی امتیاز علی صاحب قسمت کے دھنی تھے۔ اس وقت بندوبست پختہ کا کام شروع ہو گیا تھا ہر شخص اس کی زد میں آتا تھا تحقیق و تفتیش زوروں پر جاری ہو گئی تھی۔ اودھ کے تعلقدار گورنمنٹ سے اپنے حقوق حاصل کرنے میں لگے ہوئے تھے اور غریب و کمزور کاشتکاروں کو جو حقوق مل چکے تھے وہ ان کو برقرار رکھنے کی کوشش میں تھے۔ منشی صاحب نے کاشت کاروں کا ساتھ دیا۔

ان کی ہمت بڑھائی اور مسلسل کوشش کی بالآخر حکومت کو توجہ دینی پڑی۔ کامیاب ہوئے اودھ میں حقوق ماتحت کی تحقیق کی تحریک زندہ ہوئی اور کافی حد تک دادرسی بھی ہوئی۔

اسی کے ساتھ تعلقہ دار کی ترتیب و تجدید کا مسئلہ بھی درپیش تھا۔ انگریزی قانون سے یہ طبقہ بالکل ناواقف تھا جس کی وجہ سے ان کے حقوق پامال و ختم ہونے کا قوی اندیشہ و احتمال تھا۔ اس سے بچنے کے لئے مہاراجہ مان سنگھ تعلقہ دار مہدونہ نے انجمن تعلقہ داران قائم کی۔ انجمن کے اغراض و مقاصد کی تشکیل کے لئے ایک لائق و قابل ذہین قانون داں کی ضرورت تھی۔ آپ کی قانون دانی کا ہر شخص معترف تھا نظر انتخاب آپ پر پڑی اور اس انجمن کے قانونی مشیر آپ ہی بنائے گئے۔ اودھ کے تعلقہ داروں کے حقوق کی حفاظت اور ان کی شان و آن قائم و برقرار رکھنے کے لئے جو جد و جہد انہوں نے کی اس کو اودھ کے تعلقداران کا طبقہ کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔

ان تعلقداروں میں مقبولیت کی وجہ سے اور ان کی دیانتدارانہ و پر خلوص مقدمات میں محنت و پیروی کرنے اور موکلوں کی بے چون وچرا اطمینان و سکون کے ساتھ داستان الم سننے نے ان کی وکالت کو اور چاند لگا دیئے تھے۔ ان کو بہت ترقی اور فروغ ہوا جس سے تقریباً صوبہ اودھ کا بچہ بچہ اور خاص طور پر مقدمہ بازوں کے طبقے ان کے نام سے بخوبی آشنا اور واقف ہو گئے تھے اور اپنے زمانہ میں بڑے پایہ کے وکیل مانے جانے لگے تھے۔

سر سید مرحوم سے منشی امتیاز علی صاحب کے دیرینہ تعلقات تھے۔

جسٹس محمود منشی صاحب کی قانون دانی کے بڑے معترف تھے۔ لکھنؤ میں کئی مرتبہ انہوں نے کہا: "میرے چچا سر تا پا اصول قانون ہیں اور میں نے اس صوبہ میں ان جیسا کوئی قانون داں نہیں پایا"۔ آپ مہاراجہ کپور تھلہ کے بھی قانونی مشیر تھے۔ جب مہاراجہ رندھیر سنگھ والی کپور تھلہ نے اپنے خاندان کے لوگوں میں ریاست تقسیم کرنے کے بجائے نقد گزارہ دینا چاہا تو لارڈ لارنس وائسرائے ہند نے ان کے خلاف سفارش کی۔ لیکن منشی صاحب کی ذہانت اور خداداد قابلیت نے مہاراجہ کو کامیابی حاصل کرائی۔ دلائل بھری درخواست انہوں نے مہاراجہ کی طرف سے انگلستان بھیجی جس کے مطابق مہاراجہ کے حق میں فیصلہ ہوا اور وائسرائے کی سفارش نامنظور ومسترد ہوئی۔ ۱۸۶۶ء سے ۱۸۸۶ء تک جو بھی لوکل قانون نافذ ہوا اس کی پیروی آپ نے کی اور تعلقداران اودھ کے قائم مقام سفیر کی حیثیت سے ان کے حقوق کے نگراں ومحافظ رہے۔ ہائی کورٹ الہ آباد اور جوڈیشنل کمشنر اودھ کی عدالتوں کو الحاق کرنے کے لئے حکومت ایک قانون بنانا چاہتی تھی۔ آپ نے اس قانون کی مخالفت کی اور ایک شاندار ونمائندہ جلسہ لکھنؤ میں کیا۔ جس کی وجہ سے حکومت نے اس قانون کو بنانے کا ارادہ ترک کر دیا۔

۱۸۸۶ء میں سرسید احمد خاں کا اس تحریک میں ساتھ دیا کہ مسلمانوں کو کانگریس میں شامل نہ ہونا چاہئے۔ ان کی رائے تھی کہ ہندوستان ابھی اس راستہ پر چلنے کے لئے تیار نہیں ہے اور نہ مسلمان ایسے تعلیم یافتہ ہیں جس پر کانگریس ان کو لے جانا چاہتی ہے۔

منشی امتیاز علی صاحب وضعدار انسان تھے۔ مہمان نوازی میں جواب نہیں رکھتے تھے۔ انھوں نے وکالت سے بے اندازہ دولت کمائی تھی جس میں سے کافی دولت غریبوں مفلسوں کی امداد حاجت روائی پر خرچ کرتے تھے اور مہمان نوازی میں بھی صرف کرتے تھے۔ ان کا دسترخوان بڑا وسیع تھا سو سوا سو آدمیوں سے کم کسی وقت بھی دسترخوان پر نہیں ہوتے تھے مہمانوں کے لئے وہی کھانا ہوتا تھا جو خود کھاتے تھے۔ ان کی فیاضی اور سخاوت لکھنؤ میں مشہور تھی۔ ایک مرتبہ مزاحاً حضرت العلامہ مولانا عبدالحی صاحب مرحوم فرنگی محلی نے فرمایا تھا: لوگ کہتے ہیں منشی امتیاز علی بڑے سخی ہیں میں کہتا ہوں کہ وہ بخیل ہیں کیونکہ جو کچھ خدا ان کو دیتا ہے وہ اس کے بندوں کو بانٹ کر اپنے لئے عاقبت کا خزانہ جمع کر رہے ہیں اور جو خزانہ جمع کرے وہ بخیل ہے۔"

آپ نے کاکوری میں ایک مدرسہ قائم کیا تھا جس کے لئے پچاس روپیہ ماہانہ وقف کر دیا تھا۔ مدرسہ کی تعمیر کے لئے نصف روپیہ خود دیا بقیہ گورنمنٹ ایڈ کا لگا۔

مولوی فتح محمد صاحب سے خلاصۃ التفاسیر اردو میں لکھوائی جو فارسی و عربی کی مستند تفاسیر میں سے ہے اور قرآن پاک کا عطر ہے جس کی پانچ جلدیں ہیں، ان کو طبع کرا کے مفت تقسیم کرائیں۔ لکھنؤ و نواح لکھنؤ کی بوسیدہ مسجدوں کی مرمت کرائی۔ بھوپال کے زمانہ وزارت میں بھوپال سیہور چھاؤنی میں ایک مسجد اپنے پیسہ سے تعمیر کرائی۔

۱۸۸۶ء میں سرسید نے لکھنؤ میں تعلیمی کانفرنس منعقد کرنے کی خواہش

ظاہر کی۔ کانفرنس کا یہ دوسرا اجلاس تھا۔ لکھنؤ کے لوگوں نے بے التفاتی برتی کوئی تیار نہیں ہوا تو انہوں نے منشی صاحب سے کہا۔ چنانچہ انہوں نے کانفرنس کی اور اس کا تمام بار خود برداشت کیا۔ مہمانداری بھی اپنے ذمہ لی۔ جن لوگوں نے اس اجلاس کو دیکھا ہے وہ اب تک منشی صاحب کی مہمان نوازی اور پر تکلف دعوتوں کا تذکرہ کرتے ہیں

۱۸۹۲ء میں سرسید نے علی گڈھ مسلم کالج کے لئے چندہ جمع کرنے کے واسطے حیدر آباد کا سفر کیا۔ ان کو معلوم ہوا تو انہوں نے اثنائے سفر میں بھوپال آنے کی دعوت دی۔ چنانچہ سرسید معہ اپنے ساتھیوں مولینا الطاف حسین حالی، مولنا شبلی اور نواب حاجی محمد اسماعیل وغیرہ کے بھوپال مقیم ہوئے۔ دس ہزار روپے کالج کی مسجد کی تعمیر کے لئے نواب شاہجہاں بیگم والی بھوپال سے دلوائے اور خود دو ہزار روپے دیئے۔ ڈھائی ہزار روپے کا چندہ اپنے دوستوں سے دلوایا۔ اس طرح ساڑھے چودہ ہزار روپیہ سرسید کی تعلیمی جھولی میں ڈالے۔

۱۸۸۵-۸۶ء میں حکومت برطانیہ سے ریاست بھوپال کے تعلقات میں تلخی پیدا ہو گئی تھی۔ اس وقت نواب شاہجہاں بیگم نے ان کی قابلیت کا شہرہ سنا تھا تو حضرت مولینا شاہ فضل الرحمن رحمۃ اللہ علیہ کے ذریعہ وزارت بھوپال پیش کرنے کا خیال ظاہر کیا۔ اور گورنمنٹ کو بھی لکھا جب گورنمنٹ آف انڈیا نے صوبہ یوپی کی گورنمنٹ سے معلوم کیا اور رائے طلب کی تو سر آکلینڈ کالون صاحب لفٹنٹ گورنر ممالک متحدہ آگرہ نے جو منشی صاحب کی قابلیت و لیاقت سے بخوبی واقف تھے اور ان کے دوست بھی تھے، اس تجویز سے اتفاق ہی نہیں

کیا بلکہ یہ لکھا: "اگر بھوپال کے وہ وزیر بن جائیں گے تو گورنمنٹ کے مفاد اس طرح محفوظ رہیں گے جس طرح میرے وہاں ہونے سے ہوتے" چنانچہ گورنمنٹ آف انڈیا نے انہیں فوراً بھوپال کا وزیر اعظم بنا دیا۔ دسمبر ۱۸۸۹ء میں لکھنؤ سے بھوپال گئے اور وزارت کی کرسی سنبھال لی۔

جس زمانہ میں منشی امتیاز علی صاحب نے یہ ذمہ داری قبول کی ہے، یہ زمانہ بڑی بے چینی اور پریشانی کا تھا۔ ریاست میں کافی انتشار تھا مطلع سیاست نہایت غبار آلود تھا۔ نواب صدیق حسن خاں علیحدہ کر دیئے گئے تھے دو وزارتیں پے در پے ٹوٹ چکی تھیں۔ منشی صاحب نے سب سے پہلے ریاست اور حکومت ہند میں جو بداعتمادی پھیلی ہوئی تھی اس کو دور کیا۔ چنانچہ لارڈ لینسڈاون ویسرائے ہند ۱۸۹۲ء میں بھوپال آئے۔ ریاست بھوپال کی تاریخ میں ویسرائے ہند کی یہ پہلی آمد تھی ـــ ۱۸۹۱ء میں نواب شاہجہاں بیگم خود ملاقات کے لئے شملہ گئیں۔ منشی صاحب ان کے ہمراہ تھے۔ ویسرائے نے ان کی مدارات میں خود حصہ لیا پوری تعظیم و تکریم کی۔

سیاسی حالات کی اصلاح کے بعد منشی صاحب نے ریاست کے نظم و نسق کو درست کرنے کی طرف توجہ دی۔ ان کے وزیر اعظم بننے سے قبل ریاست کی آمدنی کا پچیس چھبیس لاکھ روپیہ سالانہ کا اوسط تھا لیکن ان کے انتظامات سنبھالنے کے بعد تین چار برس کے اندر سالانہ آمدنی چالیس بیالیس لاکھ روپے تک پہنچ گئی تھی۔ اسی زمانہ میں فوج کی طرف توجہ دی گئی تو انگریزی فوج کے آئین و قواعد و اسلحہ کی طرح آراستہ ہو کر گورنمنٹ انگلیشیہ کی اعانت و امداد کے لئے تیار رہتی تھی۔ انہیں کے دور میں انگریزی

سکہ ریاست میں جاری ہوا۔

ان کا عہد وزارت گورنمنٹ برطانیہ کے لئے اطمینان بخش اور ریاست کی وفاداری اور ترقی کی کوشش کا باعث بنا۔ جن کی عمدہ خدمات کا اعتراف انگریزی گورنمنٹ کی طرف سے بارہا کیا گیا۔ وزارت کی ذمہ داری عرصہ تک انجام دینے کے بعد لکھنؤ چلے گئے تھے۔ مسلمانان لکھنؤ بالخصوص فرقہ اہل سنت کے لوگ ان پر بہت اعتماد کرتے تھے۔ حکام بھی ان کی وقعت کرتے تھے۔ یوں تو وہ قدامت پسند تھے لیکن تعلیم کے حاصل کرنے میں علوم جدید ہ کے زبردست حامی تھے آپ نے ۱۸۹۲ء کی آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس لکھنؤ کی صدارت فرمائی تھی۔ ۱۶ نومبر ۱۸۹۶ء میں آپ نے انتقال فرمایا۔ منشی صاحب کے صاحبزادے منشی احتشام علی صاحب اپنی موروثی وضعداری کے حامل رہے۔ مہمان نوازی نیز قومی و ملکی کاموں میں دلچسپی و ہمدردی رکھتے تھے۔[۱]

سید علی حسن مؤلف صبح گلشن جناب صوفی کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں۔

• ذہنش رسا و طبعش نقاد، و خلقش عام لطفش تام و طینش صافی و دستش نیکو بالفعل در شہر لکھنؤ بصیغۂ وکالت باکمال رفاہ و فلاح میگذراند و پیش ہر یکے از ولاۃ و حکام آں مقام نقش لیاقت و

---

[۱] خلاصہ حالات نوشتہ منشی احتشام علی صاحب خلف اکبر منشی امتیاز علی صاحب منقول خطبات عالیہ صفحہ ۳۶ تا ۴۴۔

عزت خود برکرسی قبول می نشاند ہر چند از کثرت اشغال توجہ بشعر و شاعری کمتر دارد لیکن ہنگام التفات بدیں فن درِ ساند کہ نکلاز نیساں طبیعت لآلی آبدار، اشعار خوب تر بسیاری بارد۔ (۲۵۰)

منشی محمد امتیاز علی صاحب اردو میں بہت کم شعر کہتے تھے زیادہ تر فارسی میں طبع آزمائی فرماتے تھے۔ اردو کے چند اشعار دستیاب ہو سکے۔ [1]

ہمارے درد نے کیا کیا وفا کی — اگر پہلو سے اٹھا دل میں جا کی

پری کے دست پر دسنے وفا کی — وہ دیکھو اڑ چلی سرخی حنا کی

ہیستم ہر دم دم از قطع تعلق میزند — تیغ برآں آمد و رفتِ نفس باشد مرا

میرود با کاروان اشک من عمرِ رواں — نالہائے واپسیں بانگ جرس باشد مرا

برق حسنت شعلہ زد یکسر بجسم و جانِ ما — مشعل طور ست امشب زینتِ ایوانِ ما

دیدار از غرفہ بسوئی من د دربزد و رفت — چہ بلا تیر نگاہی بجگر در زد و رفت

تا بر و نامۂ شوقم با درِ بپیش کسے — طائر رنگ زندیم بہوا پر زد و رفت

بہار امروز با سامان صدے خانہ می آید — بدوش بیخودی چوں بوئے گل مستانہ می آید

عالم شکار تیرِ او مژگان سفاکش نگر — صید قضا نخچیر او در بند فتراکش نگر

طرزِ خرامش فتنہ زا بر ہر قدم جانہا فدا — محشر ز رفتارش بپا اندازِ بیباکش نگر

مقتول تو زیر زمیں دریا دِ چشم نرگسیں — دل جو شد از آتش ببیں گل دید از خاکش نگر

شبخوں شب ہجراں زد سکری بر لشکر ہوشم — کر چوں نعش شہیداں ہمدماں بودند بر دوشم

شد عشقِ بتاں شمع رہِ معرفتِ او — ایں آتشِ بے دود از یں سنگ گرفتم

[1] خم خانہ جاوید صد ۳۰۵ ۔

ضیاؔ

آغا سخاوت علی اکبر آبادی

آغا سخاوت علی بیگ کے والد مرزا حاتم علی مہرؔ اکبر آبادی تھے۔ مہر صاحب کے والد مرزا فیض علی بن مرزا مراد علی صاحب[1] تھے۔ مہرؔ ناسخ کے شاگرد تھے۔ صاحبِ دیوان تھے اور رسالہ پنجہ مہران کی تصنیف ہے۔ ان کا شمار اکبر آباد کے نامی شعرا میں تھا۔

چلے بھی آؤ قیامت بھی ہو چکی صاحب — بڑا عذاب ہے رہتی ہے انتظار میں روح
کرتا غضب اب تک تو ہمارا دلِ بیتاب — رکے ہوئے، ڈلتے ہوئے، دھمکاتے ہوئے ہیں

آغا ضیاؔ کے دادا اصفہانی تھے اور بادشاہی فوج میں کمانیر کی حیثیت سے ہندوستان آئے تھے۔ مرزا مراد علی خاں، المخاطب بہ رکن الدولہ جو شجاع الدولہ کے دور میں نظامت کے اور دوسرے عہدوں پر مامور تھے، ان کے پردادا تھے۔

[1] سخن شعرا، ص ۴۷۸۔

آغا ضیا ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی سے قبل فنانشل کمشنری صوبہ اودھ میں ملازم ہوئے اس کے بعد صدر نظامت آگرہ میں پیش کاری کی خدمت انجام دی۔ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کی چنگاری جب آگرہ میں پہنچی اور میدان جنگ گرم ہوا، تو اس وقت انہوں نے محبان وطن اور مجاہدین سے مقابلہ کیا اور مجاہدین کو شہید بھی کیا۔ انگریزوں کو خوش کرنے کے لئے انگریزی فوج کے سپاہیوں اور ان کے ساتھ انگریزی عورتوں کی جانیں بچائیں اور پناہ گزیں انگریزی سپاہیوں کو آگرہ سے لکھنؤ پہنچایا[۱]۔ جس کے صلہ میں انگریزی حکام نے ان کو خلعت و جاگیر عطا کی۔

۱۲۸۵ھ میں میر وزیر علی صبا مرحوم کی صاحبزادی سے ان کا عقد ہوا۔ آپ ضلع ایٹہ میں پہلے سررشتہ دار کلکٹری اور اس کے بعد تحصیلدار مقرر ہوئے۔ ۱۲۹۶ھ میں فوت ہوئے۔

جناب ضیا ملنسار و خلیق انسان تھے۔ آپ صاحب دیوان تھے۔ ؎

ان نشیلی انکھڑیوں کا کشتۂ نظارہ ہوں — میرے مرقد پر چڑھانا جام بھر بھر کر شراب

قسمیں دے دے کے زہر دیتے ہے — اے ترے پیار نے ہمیں مارا

دل میں مرے خیال ترا اے صنم رہے — روشن چراغ دیر سے شمع حرم رہے

قسمت ہی میں جو لکھی ہو افتاد کیا کرے — سر پر گرے پہاڑ تو فرہاد کیا کرے

دم گھٹ رہا ہے چین نہیں اب کسی طرح — تنگ آگیا ہوں اس دل خانہ خراب سے

آیا شباب طالب دیدار آئے ہیں — یوسف کے ساتھ ساتھ خریدار آئے ہیں

[۱] خم خانۂ جاوید، پنجم ص ۳۸۳۔

اے جنوں رہ گیا پردہ مرے پیراہن کا
دامن دشت نے بس کام کیا دامن کا

مرے مرنے کی خبر سن کر وہ فرمانے لگے
جان سے اپنی گیا ناحق، ہمارا کیا گیا

اپنے کشتہ کو نہ کر خواب عدم سے بیچین
مان او فتنۂ محشر کے جگانے والے

مر گئی بلبل ناشاد قفس میں شاید
رنگ بدلا نظر آتا ہے ضیا گلشن کا

اترا نہ روز محشر بھی نشہ شراب کا
سر پر ہمارے سایہ رہا آفتاب کا

دیکھتا ہے رخ شفاف کو کس حیرت سے
آئینہ ہے تری تصویر کا حیراں کیا کیا

نالاں ہو تیرا کشتۂ تیر نگاہ کیا
جو دے سکے نہ سانس کریگا وہ آہ کیا

آنکھوں کے آگے گردش میں دہار ہے
دیکھیں دکھائے یار کی چشم سیاہ کیا

توڑا زنجیر کو، دامن کے اڑائے ٹکڑے
اے جنوں تجھ سے ہوئے کارنمایاں کیا کیا

لطف ہے کالے کالے بادل کا
ساقیا کھول کاگ بوتل کا

سر پہ اس شوخ کے ہے لاکھ بناؤ
اوڑھنا وہ الٹ کے آنچل کا

دوش باد صبا پہ جاتا ہوں
ناتواں ہوں جنازہ ہے ہلکا

غم ہجراں ہے ہم نفس میرا
یہی ہمدم ہے روتا دل کا

••

مہجور

منشی شیو پرشاد کشمیری دہلوی

منشی شیو پرشاد کشمیری دہلی کے باشندے تھے۔ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں راجپوتانہ رزیڈنسی کے میر منشی تھے۔ اسی سال مجاہدین کے ہاتھوں مارے گئے۔ جناب مہجور انتہائی سنجیدہ اور فہیم تھے۔ ان کے بھتیجے پنڈت شیو نرائن عرصے سے جودھپور میں مصاحب راج رہے اور ان کے بیٹے پنڈت رجناتھ منتظم مہوڈ ریاست کے تھے۔ عربی، فارسی اور اردو بہترین جانتے تھے۔ [1]

نظر آتا ہے پیچ و تاب میں سانپ
ہے وہ گیسو مرے حساب میں سانپ
کس کی زلفِ سیاہ دیکھی ہے
رشک سے ہے پیچ و تاب میں سانپ

[1] تذکرہ شعرائے ہنود ص ۱۲۶۔

میکشی یہ رنگ ہے اس میں

موج ہے ساغر شراب میں سانپ

حسرتِ زلف جو لکھی ہجور

خط کے آیا مرے، جواب میں سانپ

ٹھوکر لگی جو پائے نگارین یار کی
مثل عقیق ہوگئی لوحِ مزار سرخ

کب جبین خاک میں ہے دل بے قرار سے

ہے برق جلوہ گر مرے مشت غبار سے

••

نواب یوسف علی خاں رام پوری

نواب یوسف علی خاں ناظمؔ کا خاندان عرصہ سے حکمراں چلا آتا ہے اور ان کے اجداد ہندوستان کے حکمراں رہے ہیں۔ ۱۷۰۷ء میں شہنشاہ عالمگیر کے انتقال کے بعد ان کے صاحبزادوں میں ناچاقی پیدا ہوگئی تھی جس کی وجہ سے سلطنت میں انتشار مچگیا تھا۔ یہاں تک کہ کٹھیر کے راجپوتوں نے اپنے اپنے مقلات پر اپنی حکومتیں قائم کرلی تھیں۔ ۱۱۳۱ھ مطابق ۱۷۱۹ء کے بعد فرخ سیر کے فوت ہونے پر محمد شاہ کے عہد میں جب کہ نواب عظمت اللہ خاں والیٔ کٹھیر مامور ہوئے اس زمانہ میں نواب محمد سعید خاں کے جد اعلیٰ نواب علی خاں بھی کچھ قوت کے مالک بن گئے تھے۔

داؤد خاں حافظ رحمت خاں کے والد شاہ عالم خاں کے موروثی غلام تھے۔ جب داؤد خاں اپنے باپ کی جگہ پر حکومت سے متعلق ہوئے تو اس

وقت شاہ عالم کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ اولاد کی طرح داؤد سے محبت کرتے تھے داؤد خاں جاگیر واملاک کے مختار تھے۔ اس جاگیر وغیرہ پر داؤد خاں نے اکتفا نہیں کیا بلکہ اور آگے بڑھنے کی تمنا تھی۔ ۱۷۰۷ء میں جب کہ عالمگیر کا بیٹا بادشاہت کرتا تھا، داؤد خاں ہندوستان آئے۔ ادھر ادھر پھرنے کے بعد روہیل کھنڈ پہنچے۔ عالمگیر کی اولاد جھگڑوں میں الجھی ہوئی تھی۔ جاگیردار آزمودہ کار انسان کی تلاش میں تھے۔ ایک جاگیردار نے داؤد خاں کو اپنے ہاں ملازم رکھا۔ تھوڑے دنوں میں انہوں نے ایسی ترقی کی کہ جو بیرون ہند سے آتا اس کو داؤد خاں نوکر رکھ لیتے تھے۔ یہاں تک کہ دو سو کے قریب آدمی اس نے اپنے پاس جمع کر لئے۔ اس وقت داؤد خاں دو سو ہمراہیوں کے ساتھ مدار شاہ زمیندار موضع مدکر پرگنہ بریلی بدایوں کے ملازم ہو گئے۔ مدار شاہ نے ان کو ہانکولی پرگنہ چومحلہ کو لوٹنے کے لئے روانہ کیا۔ داؤد خاں نے وہاں پہنچتے ہی موضع کا محاصرہ کر لیا۔ زمیندار مقابلہ نہ کر سکا اور مع جاٹوں کی جمعیت کے بھاگ گیا۔ جو آدمی بھاگ نہ سکے ان کو فوجیوں نے گرفتار کیا اور داؤد خاں کے سامنے لائے۔ ان میں ایک لڑکا سات آٹھ برس کا نہایت خوب صورت داؤد خاں کو نظر پڑا۔ داؤد خاں نے اس کو اپنی فرزندی میں لے لیا۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ ایک جاٹنی لچھو عورت سے کسی مسلمان سید نے شادی کر لی تھی اس کے بطن سے یہ لڑکا تھا۔ اس لڑکے کا نام علی محمد خاں رکھا گیا۔

علی محمد خاں کے آنے کے بعد داؤد خاں کا روز بروز اقتدار بڑھتا گیا۔ داؤد خاں نے مدار شاہ سے علیحدگی اختیار کر لی اور راجہ دیبی چند کوہ کماؤں کی خواہش کے مطابق ان کے ہاں ملازم ہو گئے۔ جب نواب عظمت اللہ ناظم روہیل کھنڈ کاشی پور

اور رودر پور کے سرحد کے پرگنوں پر جن میں راجہ دیبی چند کا بھی علاقہ آتا تھا فوج کشی کرنے کی ٹھانی تو راجہ نے داؤد خاں کو فوج کا سردار مقرر کیا۔ داؤد خاں عظمت اللہ سے سازباز کر کے راجہ کو ختم کرنا چاہتا تھا۔ راجہ نے اس سازش کو تاڑ لیا اور اپنے مقام پر خاموشی کے ساتھ واپس آگیا۔ اور تنخواہ تقسیم کرنے کے بہانے سے داؤد خاں کو اپنے پاس بلوایا، قید کر دیا۔ اسی قید میں داؤد خاں کا انتقال ہوا۔

داؤد خاں کی وفات کے بعد ملک شادی خاں ابن شہزاد خاں پسر عم حافظ رحمت اللہ خاں اور صدر خاں کمال زئی وغیرہ نے نواب علی محمد خاں کو داؤد خاں کا جانشین مقرر کیا اور ان کو نواب عظمت اللہ خاں کے پاس لے جا کر راجہ دیبی چند کے ظلم کو ظاہر کیا۔ انھوں نے علی محمد خاں کو ان کے ہمراہیوں کے ساتھ ملازم رکھ لیا۔ چند دنوں کے بعد علی محمد خاں نے نواب عظمت اللہ کی نوکری چھوڑ کر موضع بنیا بیولی پرگنات مقبوضہ داؤد خاں پر قبضہ کیا۔ اسی اثنا میں محمد صالح محمد شاہ بادشاہ سے بریلی کے پرگنات کی ملکیت کی اجازت لے کر آیا تھا۔ یہ بات نواب عظمت اللہ کو ناگوار گذری اس نے علی محمد خاں کو مشورہ دیا کہ محمد صالح کا خاتمہ کر دے۔ اس نے ایسا ہی کیا۔ اس کو مارنے اور منونہ وغیرہ پر قبضہ کرنے کے بعد اس کے ملازموں سے آنولہ کے زمینداروں کو قتل کرا کے وہاں اپنا مسکن بنایا۔ گرد و نواح کے زمیندار ان کے تابع ہو گئے۔ دم مارنے کی جرأت نہیں تھی ہر ایک ان سے اعانت و امداد کا طالب رہتا تھا۔ اسی عرصہ میں وزیر الممالک نواب قمر الدین کا پروانہ پہنچا کہ سادات بارہہ کی تادیب کے سلسلے میں نواب عظمت اللہ خاں کی امداد کریں۔ نواب علی محمد خاں اس پروانہ کے بعد نواب عظمت اللہ خاں کے پاس پہنچا اور جانسٹھ

میں کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ اس کے عوض وزیرالممالک نے خوش ہوکر نوابی کا خطاب اور نوبت و خلعتِ فاخرہ علی محمد خاں کو عطا کیا۔ نواب جالسٹھ سے آنولہ کی طرف آئے۔ یہاں کے روہیلے علی محمد خاں کی کم سنی کی وجہ سے ان کی اطاعت کرنے سے دریغ کرتے تھے لہٰذا مشورہ یہ ہوا کہ حافظ رحمت خاں بن شاہ عالم کو بلایا جائے۔ ان کی موجودگی میں کوئی روہیلہ اطاعت کرنے سے دریغ نہیں کرے گا۔ حافظ رحمت خاں جب روہیل کھنڈ آ گئے تو علی محمد خاں نے ان کی اسی طرح عزت کی جس طرح داؤد خاں شاہ عالم کی عزت کرتے تھے۔ فوراً چند دیہات گذارے کے لئے حافظ رحمت خاں کے نام کر دیئے۔

اسی اثنا میں ہر بند کھتری کو محمد شاہ نے مراد آباد وغیرہ کا ناظم مقرر کر دیا تھا۔ اس نے آتے ہی نواب علی محمد خاں پر حملہ کرنے کی ٹھانی۔ دریائے ارل کے کنارے لڑائی ہوئی۔ عبدالنبی خاں اور اس کا بھائی دلیر خاں اور ہر بند اپنے ساتھیوں کے ساتھ مارے گئے اور علی محمد خاں کو فتح ہوئی۔ اس وقت تمام روہیل کھنڈ مراد آباد، سنبھل، شاہ آباد اور شاہجہان پور وغیرہ پر نواب کا قبضہ ہو گیا۔۔ پیلی بھیت پر دیس پت بنجارہ قابض تھا۔ اس کو بھی قتل کر کے پیلی بھیت اور متعلقہ دیگر پرگنات پر قابض ہوئے اور حافظ رحمت خاں کو مرحمت ہوئے۔ نواب علی محمد خاں نے محمد شاہ بادشاہ کے پاس چند خطوط اپنی بے گناہی اور ہر بند کی زیادتیوں اور ظلموں کے متعلق روانہ کئے۔ بادشاہ نے معین الملک کو تحقیقات کے لئے مقرر کیا۔ جب معین الملک کے آنے کی خبر ہوئی تو دریائے گنگا کے کنارے نواب علی محمد خاں معین الملک سے ملے اور ان کو

مطمئن کر دیا۔

دو سال کے بعد دولت چند نے راجہ کلیان کے ظلم و زیادتی سے تنگ آکر نواب سے شکایت کی۔ نواب نے حافظ رحمت خاں، بخشی سردار خاں، پایندہ خاں اور نواب دوندے خاں سپہ سالار کو فوج کے ساتھ الموڑہ کو فتح کرنے کے لئے روانہ کیا۔ الموڑہ کے راجہ نے مقابلہ کیا۔ حافظ رحمت خاں نے اس کو شکست دی اور راجہ کلیان چند کے قلعہ پر بھی قبضہ کر لیا۔

اس واقعہ کے چند روز بعد امیر خاں اور صفدر جنگ نے محمد شاہ کو نواب علی محمد خاں کی طرف سے ایسا برگشتہ کیا کہ بادشاہ علی محمد خاں کے اقتدار کو ختم کرنے کے لئے ۱۱۵۸ھ میں کثیر فوج کے ساتھ سنبھل میں آگئے وہاں اپنا ڈیرہ جمایا نواب علی محمد خاں یہ خبر سن کر بہت پریشان ہوئے۔ بادشاہ کی خدمت میں اپنی اطاعت و فرمانبرداری کو ظاہر کرنے کے لئے چٹھیاں بھیجیں اور وزیر الممالک سے بھی بیحد کوشش کرائی کہ بادشاہ ان کا قصور معاف کر دیں۔ لیکن بادشاہ کی خفگی و ناراضگی کسی صورت سے بھی ختم نہیں ہوئی۔ قائم خاں اور امیر خاں فوج شاہی نے ان پر حملہ بھی کر دیا۔ نواب نے حملہ ہونے کے بعد دو تین روز تک چٹھیوں کے جواب کا انتظار کیا۔ جب جواب نہیں آیا اور حالات نازک ترین و خطرناک بن گئے تو خود بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور قدموں پر گر گئے۔ بادشاہ نے حراست میں لے کر وزیر الممالک کے سپرد نواب علی محمد خاں کو کر دیا۔ اور روہیل کھنڈ کی حکومت پر فرید الدین صاحب پسر عظمت اللہ خاں اور ریدالاسلام کو مامور کر دیا۔ اور دہلی چلے گئے۔ وزیر الممالک نواب کے حق میں تھے ایک روز موقع پا کر نواب کے

قصور کی معافی کرائی۔ بادشاہ نے سرہند پر قبضہ کرنے کے لئے ان کو حکم دیا اور خلعت فاخرہ مع اسپ وفیل اور نوبت ونشان اور بحالی منصب عطا کر کے نوابی کا خطاب عنایت کیا۔ حافظ رحمت خاں کے پاس نواب علی محمد خاں کی چٹھی آئی کہ اپنے منتشر ساتھیوں اور فوج کو جمع کریں۔ کافی کوشش کی گئی تو سات ہزار پیادہ اور سوار جمع ہوئے اور سرہند کو روانہ ہوئے۔ بطریق یرغمال اپنے لڑکوں عبداللہ اور فیض اللہ کو وزیرالممالک کے پاس چھوڑ گئے۔ سرہند پر قبضہ کرنے کے لئے بڑی جنگ وجدال اور قتل وغارت گری ہوئی۔ حافظ رحمت خاں کی اولوالعزمی، شجاعت اور بہادری نے بھی جوہر دکھائے تب جاکر تمام سرہند فتح ہوا۔

۱۱۵۵ھ میں احمد شاہ ابدالی کی ہندوستان میں آنے کی خبر مشہور ہوئی۔ محمد شاہ بادشاہ کو نواب علی محمد خاں کی طرف سے خطرہ محسوس ہوا کہ یہ احمد شاہ ابدالی کا ہم قوم ہے کہیں اس کے ساتھ مل کر حملہ کرا کے ملک پر قبضہ نہ کر لے۔ وزیرالممالک سے بادشاہ نے مشورہ کیا۔ یہ پہلے سے نواب کے حامی تھے خطرہ بھی صحیح تھا۔ اس نے کہا حضور نواب علی محمد خاں کو روہیل کھنڈ عطا فرما دیں۔ بادشاہ نے وزیر کی رائے سے اتفاق کیا اور فوراً نواب صاحب کو روہیل کھنڈ دینے کا حکم بھیجدیا۔ یہ حکم نامہ نواب کو ابھی ملا بھی نہیں تھا کہ احمد شاہ ابدالی نے نواب علی محمد خاں کو ایک خط لکھا اگر تم میرے ساتھ اس جنگ میں شامل ہو جاؤ گے تو کامیابی کے بعد سلطنتِ ہند کی وزارت پر تم متمکن ہو گے۔

نواب علی محمد خاں وزیرالممالک کے احسان کی وجہ سے شش و پنج میں پڑ گیا۔ اتنے میں اس کو محمد شاہ کا حکم نامہ بھی مل گیا۔ نواب نے سرہند کا انتظام

کسی شخص کے سپرد کیا اور حافظ رحمت خاں کے ساتھ روہیل کھنڈ روانہ ہو گئے۔ لشکر کے خوف کی وجہ سے چتر بھوج ہدایت علی خاں بریلی و مراد آباد کے قلعے خالی کر کے چلے گئے کٹھیر کے تقریباً پورے علاقہ پر نواب علی محمد خاں قابض ہو گئے۔

احمد شاہ نے ہندوستان میں قدم رکھتے ہی جنگ شروع کر دی۔ سرہند کے مورچہ پر وزیرالممالک ابدالی کی گولی سے مارے گئے۔ عبداللہ خاں اور فیض اللہ خاں پسران نواب علی محمد خاں کو قید کیا اور احمد شاہ ابدالی ان کو اپنے ساتھ لے گئے۔

وزیرالممالک کے مارے جانے اور دونوں لڑکوں کے لے جانے کی وجہ سے نواب علی محمد خاں کو بیحد صدمہ ہوا۔ یہ مرض استسقا کے مریض تھے اس مرض نے اور زور پکڑا۔ اسی اثنا میں ابوالمنصور صفدر جنگ والد شجاع الدولہ نے نواب کے پاس یہ خبر پہنچائی کہ ۲۸ ربیع الثانی ۱۱۶۱ھ مطابق ۱۷۴۸ء کو محمد شاہ نے انتقال کیا اور اس کی جگہ احمد شاہ تخت نشین ہوئے ہیں۔ عہدۂ وزارت خالی ہے بادشاہ مجھ کو وزیر بنانا چاہتے ہیں مگر امرائے تورانی چاہتے ہیں کہ خلعت وزارت انتظام الدولہ خانخاناں پسر قمرالدین کو دیا جائے۔ اگر تم اس وقت آکر مدد کرو تو انتہائی عنایت ہوگی۔ نواب علی محمد خاں چاہتے تھے کہ دہلی پہنچکر احمد شاہ سے صفائی کی جائے اور صفدر جنگ کی امداد بھی کی جائے۔ لیکن مرض کی شدت کی وجہ سے خود نہیں جا سکے، حافظ رحمت خاں کو مع فوج کے روانہ کر دیا۔ ان کے پہنچنے کی وجہ سے صفدر جنگ وزیر بنے۔ اس کے صلہ میں حافظ رحمت خاں کو دربار شاہی میں صفدر جنگ لے گیا۔ ان کو خلعت فاخرہ، نوبت اور نشان اور خطاب

مکرم الدولہ حافظ رحمت خاں بہادر نصیر جنگ ۔۔ ۔۔۔ دلوایا۔ دہلی سے بہت جلد فارغ ہونے کے بعد حافظ رحمت خاں روہیل کھنڈ پہنچے۔ تمام حالات سے علی محمد خاں کو آگاہ کیا۔ اس وقت مرض استسقا نے خوفناک صورت اختیار کرلی تھی۔ حکیم سید احمد گیلانی نے علاج کرنے میں کوئی کسر اٹھا کر نہیں رکھی۔ آخر ۵ شوال ۱۱۶۱ھ مطابق ۱۷۴۸ء کو قصبہ آنولہ میں فوت ہوئے۔ چھ صاحبزادے عبداللہ خاں، فیض اللہ خاں، سعداللہ خاں، محمد یار خاں، اللہ یار خاں اور مرتضیٰ خاں اور کئی لڑکیاں چھوڑیں۔

جس وقت نواب علی محمد خاں قریب المرگ ہوئے تمام اراکین سلطنت کو انہوں نے جمع کیا اور تیسرے بیٹے سعداللہ خاں کے سر پر پگڑی رکھ کر ان کو اپنا جانشین بنایا اور تمام عہدیداروں اور سالاروں کو مخاطب کر کے کہا،

"تم سب اچھی طرح جانتے ہو کہ حافظ رحمت خاں ابن شاہ عالم کے حقوق میرے اور میرے باپ کے ذمہ کس قدر تھے اس لئے سابقہ تعلقات کی بنا پر میں ان کو اپنے لڑکے کا نائب بناتا ہوں تم کو چاہیے کہ ان کی اطاعت کرنا اور کبھی ان کے کہنے کو نہ ٹالنا ہر امر میں دل وجان کے ساتھ فرمانبردار رہنا۔ ایسا نہ ہو کہ میرے بعد نااتفاقی ہو جائے اور تم منتشر ہو کر پریشان ہو۔ اس ریاست کی بنیاد بڑی جانفشانی سے رکھی ہے اور اس کو پروان بھی بڑی مصیبتیں جھیلنے کے بعد چڑھایا ہے۔"

سب اراکین سلطنت نے حافظ رحمت خاں کی اطاعت قبول و منظور کی

اور نواب صاحب کے سامنے اقرار کیا کہ ہم ان کے نائب بننے سے بہت خوش ہیں اور
رضامند بھی ہیں۔ اس کے بعد نواب علی محمد خاں صاحب نے حافظ رحمت خاں کی
طرف متوجہ ہو کر کہا کہ سعد اللہ ابھی چھوٹی عمر کا ہے اس لئے سلطنت کا تمام کاروبار
تمہارے سپرد کیا جاتا ہے۔ حافظ رحمت خاں نے بھی اطمینان دلایا کہ میں بذاتِ
خود ریاست کا بندوبست کروں گا۔

۱۱۶۱ھ مطابق ۱۷۴۸ء کو نواب علی محمد خاں کا انتقال ہوا۔ حافظ رحمت
خاں ریاست کا انتظام خوش اسلوبی سے چلانے لگے۔ چھ مہینے گذرنے نہیں پائے
تھے کہ صفدر جنگ اپنے عہد و پیمان سے پھر گیا، جو اس نے حافظ رحمت خاں سے
وزارت پانے کے وقت کئے تھے اور قطب الدین خاں نبیرہ نواب عظمت اللہ
خاں کو احمد شاہ بادشاہ سے روہیل کھنڈ کی سند دلوا کر بھیجدیا۔ قطب الدین خاں
کو حافظ رحمت خاں نے صلح کا نامہ و پیام بھیجا مگر قطب الدین جنگ کے ارادے
سے باز نہیں آیا۔ حافظ رحمت خاں نے دوندے خاں کو قطب الدین خاں سے
مقابلہ کرنے کے لئے بریلی سے روانہ کیا۔ جنگ و پیکار کافی ہونے کے بعد
قطب الدین خاں ۱۱۶۱ھ میں مارا گیا اور اس کی فوج نے فراری اختیار کی۔ حافظ
رحمت خاں نے فتح پائی۔ صفدر جنگ افغانوں میں پھوٹ ڈالنا چاہتا تھا۔ اس
نے نواب قائم خاں ابن محمد خاں بنگش ون ہزاری رئیس فرخ آباد کو کٹھیر کے افغانوں
سے لڑنے کے لئے آمادہ کیا۔ قائم خاں نے ہم قومی کا خیال نہیں کیا اور روہیل
کھنڈ کی سند اپنے نام لکھوالی اور فرخ آباد سے روانہ ہو کر دریائے گنگ عبور
کر کے فوج کے ساتھ اوسہت میں ڈیرہ جمایا اور مقام دونری جو آنولہ سے

چودہ کوس پر ہے وہاں میدان جنگ گرم ہوا۔ ہزاروں انسان موت کے گھاٹ اتارے گئے اور قائم خاں مع باون فیل جنگی اور کافی رؤسا کے ساتھ عین معرکہ میں ہلاک ہوا۔ اس فتح خداداد کے بعد بدایوں، پرگنات مہرآباد اور اوسہت جو فرخ آباد کی ریاست میں شامل تھے، اپنے قبضہ میں کئے۔ اور فرخ آباد وغیرہ زوجہ محمد خاں بنگش کو دیدیا۔ اس لڑائی میں حافظ الملک حافظ رحمت خاں نواب سعداللہ خاں خوردسال کو سردار بنا کر ہمراہ لے گئے تھے۔

نواب علی محمد خاں کے انتقال کے وقت سے ہی حافظ رحمت خاں احمد شاہ ابدالی کو عبداللہ اور فیض اللہ کی رہائی کے بارے میں برابر لکھتے رہے۔ جب احمد شاہ ابدالی نے ۱۱۶۴ھ مطابق ۱۷۵۱ء کو ہندوستان میں دوبارہ آکر کوڑامل کو قتل کر کے معین الملک کو لاہور کا ناظم مقرر کیا، اس وقت عبداللہ خاں اور فیض اللہ خاں کو قید سے رہائی بخشی۔ یہ دونوں رہا ہونے کے بعد روہیل کھنڈ آئے اور ۱۱۶۶ھ مطابق ۱۷۵۳ء کو اس خاندان میں حسب ذیل طریقے سے ملک کی تقسیم ہوئی۔

پرگنات اوجھیانی وغیرہ مجمع تین لاکھ روپیہ سالانہ کے نواب عبداللہ خاں اور مرتضیٰ خاں کا حصہ قرار پایا، اور نواب فیض اللہ خاں کو رامپور وغیرہ بشراکت نواب محمد یار خاں ملا۔ پرگنات آنولہ وغیرہ بحساب سات لاکھ روپیہ سالانہ بشرکت نواب اللہ یار خاں کے نواب سعداللہ خاں کے حصہ میں آئے۔ شہر مرادآباد، سنبھل، کاشی پور، ٹھاکردوارہ اور امروہہ نواب دوندے خاں کو مع تنخواہ رسالہ کے ملا۔ اور شہر بدایوں اور اوسہت وغیرہ فتح خاں خانساماں کو دیا گیا۔

پرگنات کوٹ وغیرہ بخشی سردار خاں کو دیئے۔ شاہجہان پور، بریلی، پیلی بھیت اور چند پرگنات دامن کوہ حافظ رحمت خاں کے متعلق کئے گئے۔

اس تقسیم پر سب خوش تھے لیکن نواب عبداللہ جو علی محمد خاں کے سب سے بڑے صاحبزادے تھے، نواب سعداللہ خاں کے رئیس ہونے سے ناراض وخفا ہوئے اور حافظ رحمت خاں کو کئی مرتبہ زہر دیکر ہلاک کرنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہیں ہوئے رحبب دیکھا کہ یہ اپنی شرارتوں سے باز نہیں آتے تو ان کو کہلا بھیجا کہ تم رہیل کھنڈ چھوڑ دو۔ یہ مجبوراً طاقت نہ ہونے کی وجہ سے فرخ آباد چلے گئے۔ تھوڑے عرصہ کے بعد احمد خاں بنگش کی سفارش پر حافظ رحمت خاں نے ان کا قصور معاف کر دیا اور رہیل کھنڈ میں رہنے کی اجازت دی۔ انہوں نے اجیھانی میں سکونت اختیار کی۔ ان کو سانپ پالنے کا شوق تھا ایک روز سانپ نے ان کو کاٹ لیا ۱۷۵۷ء میں فوت ہوئے، مرتضیٰ خاں نے سکندر آباد میں انتقال کیا۔ اللہ یار خاں نے سل کے عارضہ میں جان دی۔ پھر دوبارہ ملک تقسیم ہوا۔ حافظ رحمت خاں نے پیلی بھیت آباد کر کے اس کو دارالریاست قرار دیا اور حافظ آباد اس کا نام رکھا۔ نواب علی محمد خاں کی لڑکی سے اپنے بڑے بیٹے عنایت خاں کی شادی کی ۱۱۷۰ھ مطابق ۱۷۶۷ء کو نواب سعداللہ خاں فوت ہوئے۔ اس وقت سوائے حافظ رحمت خاں کے کوئی والی روہیل کھنڈ نہیں تھا۔ حافظ رحمت خاں کے ماتحت نواب عبداللہ رئیس شاہجہاں پور نواب دوندے خاں، نواب فیض اللہ خاں اور بخشی سردار خاں وغیرہ تھے جو آخر دم تک ان کے ہمنوا رہے۔

جب حافظ رحمت خاں کی نواب شجاع الدولہ اور جرنیل چاپکیں سے جنگ ہوئی اور حافظ رحمت خاں نے آخری معرکہ میں آنولہ سے کوچ کر کے کٹرہ میں خیمہ کیا تھا تو نواب فیض اللہ اور اکثر رسالہ دار حافظ رحمت خاں کا عزم جنگ سن کر حاضر ہوئے اور جب جرنیل چاپچین نے حافظ رحمت خاں کے لشکر پر توپیں چلانا شروع کیں تو جنگ کا نقشہ حافظ رحمت خاں کے حق میں نہیں تھا جس کو حافظ رحمت خاں بھی سمجھتے تھے۔ اس وقت بھی نواب فیض اللہ کا ڈیرہ حافظ رحمت خاں کے ڈیرہ کے قریب نصب تھا۔ حافظ رحمت خاں پرنم تھے انہوں نے فیض اللہ خاں کو نصیحت کی۔

• بعد شکست تم ہرگز ارادہ جنگ نہ کرنا اور جانب پہاڑ چلے جانا کیونکہ روہیل کھنڈ میں پہاڑ سے بڑھ کر کوئی جگہ امن کی نہیں ہے اور جو کوئی میرے بیٹوں میں سے ارادہ جانے کا کرے اس کو بھی ہمراہ لے جانا۔"

یہ نصیحت کر کے حافظ میدانِ جنگ میں کود پڑے۔ توپ کا گولہ حافظ صاحب کے سینہ پر لگا۔ گھوڑے کی زین سے گر کر ۱۱ صفر شنبہ ۱۱۸۸ھ مطابق ۲۸ اپریل ۱۷۷۴ء کو جاں بحق ہوئے۔ (قطعہ تاریخ۔ ؎

بچوں شد حافظ الملک راہی بجنت | بشوق بہشت انجہاں کرد پدرود
شد طالب سال تاریخ او دا | بگفتا خرد حافظ مومناں بود

حافظ رحمت خاں کے شکست پانے کے بعد نواب شجاع الدولہ نے ان کے خاندان کے ساتھ معاندانہ طریقہ اختیار کیا اور خاندان کے کافی لوگوں کو جیل میں ڈال دیا تو اسی اثنا میں نواب شجاع الدولہ کے جسم پر ایک دنبل

نمودار ہوا جس سے بڑی تکلیف ہوتی تھی جو برداشت کے قابل نہیں تھی۔ اس کا علاج ہوا لیکن کوئی صورت اس کے ختم ہونے کی نظر نہیں آتی تھی۔ اس وقت نواب شجاع الدولہ نے نواب فیض اللہ خاں سے مصالحت کی گفتگو کی۔ اس لئے کہ ان کے پاس روہیلے جمع ہونے شروع ہو گئے تھے انہوں نے صلح سے احتراز کیا تو نواب شجاع الدولہ نے خلعت سرفرازی دیتے کے لئے الہ آباد کے قلعہ سے نواب محبت خاں کو طلب کیا۔ یہ خبر نواب فیض اللہ خاں کو ملی تو یہ نواب شجاع الدولہ کے لشکر میں پہنچے اور تورک صاحب اور بارن صاحب کی معرفت جرنیل چاپکین کی ملازمت کی۔ ان ہی صاحب کی معرفت چودہ لاکھ پچھتر ہزار روپیہ سالانہ پر صلح قرار پائی۔ پرگنات رامپور، بلاسپور، اور اجاون، ٹھاکر دوارہ ٹھیرا، سرکڑا، شاہ آباد، چومحلہ اور سرساوان نواب شجاع الدولہ نے نواب فیض اللہ خاں کو دیئے اور ۱۲ رجب ۱۱۸۸ھ مطابق ۷ اکتوبر ۱۷۷۴ء کو نواب فیض اللہ خاں نے نواب شجاع الدولہ کو حسب ذیل عہدنامہ لکھ کر دیا۔

"چونکہ رسم ملت و صورت اخلاص و مودت فیمابین مجھ مقر اور نواب وزیر الممالک کے مقرر و مؤید ہوئے اور نواب وزیر الممالک نے ایک ملک مجھ کو عطا کیا۔ اس لئے میں بشہادت خدا و رسول و قسم قرآن مجید کے اقرار کرتا ہوں کہ مادام العمر نواب وزیر کا مطیع و منقاد رہوں گا اور پانچ ہزار فوج حسب اجازت نواب وزیر اپنے پاس رکھوں گا اور جس کسی سے نواب وزیر کو مقابلہ اور مجادلہ درپیش ہو گا میں ان کی امداد و معاونت میں حاضر ہوں گا اور جو نواب وزیر کسی مخالف پر فوج کشی فرماویں تو میں دو تین ہزار فوج واسطے مدد

کے بھیجوں گا اور جو وہ بذات خاص عازم کسی مہم کے ہوں گے تو میں بھی بذات خود مع فوج متعلقہ کے ان کے ساتھ ہوں گا اور سوائے نواب وزیرالممالک کے اور کسی شخص سے بجز سرداران انگلیشہ کے طریقہ محبت واخلاص کا مرعی نہ رکھوں گا. اور جو کچھ نواب ممدوح کا حکم ہوگا اس کی بجاآوری میں بدل ساعی رہوں گا. اور ہر رنج وراحت کا شریک رہ کر تعمیل شرائط عہد نامہ باحسن وجوہ بجا لاتا رہوں گا. لہٰذا بشہادت خدا ورسول اور بقسم اس کے کلام پاک کے اس عہد نامہ کو مؤکد کر کے اقرار کرتا ہوں کہ جو برخلاف شرائط ہٰذا کے کوئی بات عمل میں لاؤں تو عنداللہ ماخوذ و روبرو رسول اللہؐ مجرم ٹھہروں۔"

اس عہدنامہ کے بعد رامپور کو نواب فیض اللہ خاں نے دارالریاست قرار دیا۔ ہر ایک رسالہ دار و عہدیدار کے لئے مناسب وظیفہ مقرر کیا اور ہر فرد و بشر کو حسن سلوک سے مطمئن وخوش رکھا۔ نواب علی محمد خاں کے پوتوں نواب احمد یار خاں، نواب نصراللہ خاں اور مصطفیٰ خاں کے لئے بڑی رقموں کے وظیفے مقرر کئے۔ تیس برس تک حکومت کی اور ۸ ارذی الحجہ ۱۲۰۸ھ مطابق ۱۷ جولائی ۱۷۹۴ء کو سفر آخرت اختیار کیا۔ کسی شاعر نے نواب صاحب کی تاریخ یہ کہی۔ ؎

عزم نواب فیض اللہ خاں — پئے بندوبست جہان بقا
بمغرب فرو رفت شمس الانام — غروبست سال وفاتش بجا

۱۲۰۸ھ

نواب فیض اللہ خاں کے آٹھ بیٹے محمد علی خاں، حسن علی خاں، فتح علی خاں، غلام محمد خاں، نظام علی خاں، قاسم علی خاں، یعقوب علی خاں، اور کریم اللہ خاں تھے۔

نواب فیض اللہ خاں کی وفات کے بعد اسی سنہ میں نواب محمد علی خاں جو سب سے بڑے بیٹے تھے اور جن کو باپ نے اپنی زندگی میں ولی عہد کیا تھا، مسند ریاست پر بیٹھے۔ یہ بہت مغرور تھے ہر شخص ان کی سختی اور بد دماغی سے تنگ تھا۔ اس وجہ سے تمام رسالہ داران وغیرہ ان سے متنفر ہو کر نواب غلام محمد خاں کے حامی ہوئے اور محمد عمر، بخو خاں، بلند خاں، سیف الدین خاں، اکبر خاں وغیرہ کی فہمائش پر نواب غلام محمد خاں نے ارادہ مسند نشینی کر لیا تھا چند روز میں ان لوگوں کو بھی جو محمد علی خاں کے حامی و ہمنوا تھے، غلام محمد خاں نے اپنا بہی خواہ بنا لیا تھا۔ اس کے بعد غلام محمد خاں نے ۱۲ محرم ۱۲۰۹ھ مطابق ۱۱ اگست ۱۷۹۴ء کو مسلح آدمیوں کے ساتھ قلعہ کے اندر نواب محمد علی خاں کے قتل کا ارادہ کیا۔ نواب محمد علی خاں سمجھ گئے کہ میرے قتل کے لئے آئے ہیں۔ انہوں نے فوراً نواب غلام محمد خاں پر شمشیر سے حملہ کیا لیکن تنہا تھے اور نواب غلام محمد خاں کے ساتھ کافی آدمی تھے۔ نواب غلام محمد خاں کو کوئی نقصان نہیں پہنچا بلکہ ان کے آدمیوں نے نواب محمد علی خاں کو مجروح کر کے قلعہ ڈونگر پور میں قید کر دیا۔ کاری زخم لگے تھے جن کی وجہ سے ۲۴ محرم ۱۲۰۹ھ مطابق ۱۲ اگست ۱۷۹۴ء کو انہوں نے انتقال کیا۔ حضرت پور کے دروازہ کے قریب دفن ہوئے۔

بیگم محمد علی خاں کی درخواست اور ناظمان رہیل کھنڈ کی رپورٹیں نواب آصف الدولہ کو جب پہنچیں تو ان کا دریائے غضب جوش میں آیا اور نواب غلام محمد خاں کی تادیب کے لئے انگریزی فوج کے ساتھ رہیل کھنڈ پہنچے اور تلہر پر وغیرہ

جمایا مسٹر جان شور گورنر جنرل ہند نے آصف الدولہ کی مدد کے لئے جرنیل ابرکرمبی کو بھیجا۔ ان کو آصف الدولہ نے رامپور روانہ کیا۔ انہوں نے دریائے سنکھا پر فوج اتاری۔ نواب غلام محمد خاں کو آصف الدولہ کی مع انگریزی فوج کے آمد کی اطلاع پہنچی تو یہ پہاڑ پر جانا چاہتے تھے۔ بجو خاں وغیرہ کو اپنی بہادری اور شجاعت پر ناز و گھمنڈ تھا۔ ان کو پہاڑ پر جانے سے روکا اور مقابلہ کرنے کے لئے رام پور سے روانہ ہو کر بٹورہ میں مقام کیا۔ جنگ چھڑی بجو خاں اور بلند خاں مارے گئے انگریزی فوج کے بھی اکثر ملازم کام میں آئے کرنل مرنگٹن بھی مارے گئے خوب خون خرابا ہوا۔ نتیجہ میں انگریزی فوج کامیاب ہوئی۔ نواب غلام محمد خاں شکست کھا کر رامپور آئے اور اہل وعیاں کو ہمراہ لیکر پہاڑ پر چلے گئے۔ آصف الدولہ فتح کی خبر سن کر تلہر سے رامپور آئے اور نواب احمد علی خاں خلف نواب محمد علی خاں کو مسند ریاست پر بٹھایا۔ نواب احمد علی خاں اس وقت سات برس کے تھے۔ ان کا نائب نواب نصر اللہ خاں خلف نواب عبد اللہ خاں کو مقرر کیا۔ پھر غلام محمد خاں کے تعاقب میں پہاڑ پر پہنچے۔ نواب غلام محمد خاں نے دیکھا سوائے اطاعت کے اور کوئی چارہ نہیں ہے۔ نواب آصف الدولہ کے سامنے پیش ہوئے قصوروں کی معافی چاہی۔ انہوں نے ان کو مقید کر دیا چند روز کے بعد رہائی ملی۔ حج بیت اللہ کو تشریف لے گئے۔ واپس آکر "نادوں" میں چند روز مقیم ہو کر انتقال فرما گئے۔ پانچ بیٹے محمد سعید خاں، عبد العلی خاں، عبد اللہ خاں، حفیظ اللہ اور عبد الرحمٰن یادگار چھوڑے۔

نواب نصر اللہ خاں پندرہ برس تک نیابت کر کے ۱۲۲۴ھ مطابق ۱۸۱۰ء

کو فوت ہوئے۔ ان کی جگہ پر نصرت اللہ پسر نصر اللہ خاں مامور ہوئے۔ بقا کسی کو نہیں ہے سب کو فنا ہے۔ ۲۵ جمادی الاول ۱۲۵۶ھ مطابق ۲۶ جولائی ۱۸۴۰ء میں نواب احمد علی خاں بھی دنیائے فانی سے سدھارے، مزار حسن شاہ درویش کے نان کار میں مدفون ہوئے۔ تاریخ انتقال نواب مذکور کی غروب کوکب ہے۔ سلہ

نواب سید احمد علی خاں کی ایک صاحبزادی سمہ تاجدار بیگم تھیں۔ اولاد نرینہ پیدا نہیں ہوئی تھی۔ ان صاحبزادی کی مسند نشینی انگریز گورنمنٹ نے منظور نہیں کی۔ مسٹر فرلنسنس ریذیڈنٹس قائم مقام ایجنٹ ریاست و کمشنر رہیل کھنڈ نے نواب سید فیض اللہ کے خاندان سے نواب سید محمد سعید خاں جو اس وقت بدایوں میں ڈپٹی کلکٹر تھے ان کو مستحق مسند جانشینی سمجھا اور ۲۱ جمادی الآخر ۱۲۵۶ھ مطابق ۲۰ اگست ۱۸۴۰ء کو نواب محمد سعید خاں مسند نشین ہوئے جس کی تاریخ اس مصرع سے نکلتی ہے۔ ؎

آب رفتہ باز در جو آمدش

حکیم مومن خاں مومنؔ دہلوی نے حسب ذیل تاریخی قطعہ کہا۔ سلہ

رام پور ایک زبانِ ممتد ہے ترے مقدم کا تھا تمنائی

سلہ نواب یوسف علی خاں کے حالات اور رام پور کی تاریخ کے واقعات ابتدائے مضمون سے یہاں تک تاریخ رہیل کھنڈ مؤلفہ نواب نیاز احمد خاں نبیرہ حافظ رحمت خاں سے اخذ کئے گئے ہیں۔ سلہ کلیات مومن۔

جب پذیرا ہوئی دعائے دیار | اے سراپا قبول والائی
یعنے اس ملک کے نصیب کھلے | تیرے قدموں پہ کی جبیں سائی
تیرے خدام کو نصیب ہوئی | حکمرانی وکار فرمائی
تجھ کو شائستہ کرسیٔ عزت | تجھ کو زیبا سریر آرائی
میں ہوا گرم فکر سالِ جلوس | ناگہاں غیب سے صدا آئی
کہ محمد سعید خاں کو ملی | ورثۂ صدر کام آبائی

اس دسادے پہ تجھ کو بٹھلا کر
میں نے تاریخ کی روش پائی"

نواب صاحب طب بھی اچھی جانتے تھے۔حکیم مرزا علی صاحب لکھنوی کے شاگرد تھے۔ نثر عاری خوب لکھتے تھے مرزا قتیل سے اس فن میں مشورہ کرتے تھے۔ درسیہ کتابیں میر قطبی تک پڑھی تھیں۔

نواب سید محمد سعید خاں کے ہمراہ دو شخص شاہ محمد خاں مرادآبادی اور حکیم سعادت علی خاں آنولوی آئے تھے۔ یہ دونوں عاقل و لائق فہیم و متین تھے۔ شاہ محمد خاں نائب مقرر ہوئے اور حکیم سعادت علی خاں فوج کی جرنلی پر مامور ہوئے۔ نواب صاحب اصول ریاست سے واقف تھے۔ ان کے ساتھ اہل کار بھی تجربہ کار تھے۔ تمام ریاست کا انتظام نواب صاحب خود صبح کے چار بجے سے رات کے گیارہ بجے تک کرتے تھے۔

رام پور کا تمام شہر خام تھا نواب صاحب کے انتظام سے عمارتیں پختہ بننے لگی اور کھیس اوڑھنے کا دستور تھا، اس عہد میں رومال اور دوشالے اوڑھے

لگے۔ سید احمد علی خاں کے عہد میں شہر کے بازاروں کی حالت خراب تھی۔ گو در دروازہ قلعہ نواب سید فیض اللہ خاں سے بازار صاحبزادہ نیاز علی خاں تک دکانیں تھیں مگر سائبان کہیں چھپر کے تھے کہیں کھپریل کے اور سڑک بھی تنگ اور دکانیں پست تھیں۔ ان کے عہد میں بازار ٹوٹا چھتیں بلند کی گئیں، سائبان موقوف ہوئے۔ بعض بازاروں میں سڑکوں کے نہ ہونے کی وجہ سے کیچڑ بے پناہ تھی چلنا پھرنا مشکل ہو جاتا تھا چند مقامات کی بھی بہت بری حالت تھی، ان کی صفائی نواب صاحب نے کرائی۔

مولانا عبدالقادر صاحب مرادآبادی جب یہاں آ کر ملازم ہوئے تو راستے صاف وستھرے پائے۔ نواب صاحب سے کہا بہت افسوس کا مقام ہے کہ آپ نے اپنی ریاست میں وہ کیچڑیں جو صاحبزادہ سید سعادت علی خاں اور صاحبزادہ نیاز علی خاں اور صاحبزادہ سید احمد یار خاں کے مکانوں کے قریب تھیں نواب سید فیض اللہ خاں کے عہد سے ان کی شہرت تھی، بالکل صاف کرا دیں، ضروری تھا کہ ان کا کچھ نشان رکھا جاتا۔

نواب صاحب مذہب امامیہ سے تعلق رکھتے تھے ایک امام باڑہ خورشید منزل کے قریب تعمیر کرایا۔ مذہبی جھگڑوں میں نواب صاحب نہیں پھنسے تھے اور نہ ہی اپنے دربار میں مذہبی بحث کرنے دیتے تھے۔ ایک مرتبہ لکھنؤ کے ایک شیعہ صاحب کی زبان سے جو نواب صاحب کے دوستوں میں سے تھے، اس قسم کی بات نکل گئی جس سے اہل سنت حضرات کی دل آزاری ہوتی تھی۔ ان سے آپ نے کہا کیا آپ میری ریاست میں فتور ڈالنا چاہتے ہیں اور فوراً ان کو

علیحدہ کر دیا۔

نواب محمد سعید خاں صاحب کا انتقال ۱۳ رجب ۱۲۷۱ھ مطابق یکم اپریل ۱۸۵۵ء کو ہوا۔ ان کی پیدائش کی تاریخ ۲ رجب ۱۲۰۰ھ مطابق ۱۵ مئی ۱۷۸۶ء ہے۔ ۷۱ سال کی عمر پائی اور ۱۵ سال ۲۱ روز حکمرانی کی۔ نواب صاحب کی اولاد حسب ذیل تھی۔

(۱) نواب سید یوسف علی خاں فتح النساء بیگم بنت محمد نور خاں ہمشیرزادہ نواب سید فیض اللہ خاں کے بطن سے تھے یہ نور محمد خاں محمد شاہ خاں بڑے بیچ کے صاحبزادے تھے (۲) سید کاظم علی خاں عرف چھوٹے فتح النساء بیگم (۳) سید صفدر علی خاں محمدی خواص کے بطن سے تھے (۴) سید مبارک علی خاں شاہان خواص (۵) اور سید کلب حسن خاں بنی بائی گائن کے بطن سے تھے۔

نواب یوسف علی خاں صاحب نہایت خوش اخلاق و بیدار مغز رئیس تھے اہل کمالات سے ان کو محبت تھی۔ ان کو علوم عقلیہ منطق و حکمت میں کمال حاصل تھا اور ان علوم کو مولوی فضل حق خیر آبادی سے حاصل کیا تھا۔ فارسی زبان خلیفہ غیاث الدین سے سیکھی تھی۔ خوش بیانی میں جواب نہیں رکھتے تھے۔ ڈاڑھی مونچھیں صاف رہتی تھیں۔ سجیلے اور حسین وجمیل تھے۔ ۱۸۵۱ء کو لارڈ ڈلہوزی گورنر جنرل ہند رام پور آئے۔ لارڈ صاحب نے بڑے دیوان خانہ میں دربار کیا۔ اس کا انتظام نواب سید محمد سعید صاحب نے خود فرمایا جس سے لارڈ صاحب بہت خوش ہوئے۔ نواب صاحب نے وقت کو مناسب سمجھ کر نواب محمد یوسف علی خاں کو ولی عہد بنانے کی خواہش کا اظہار کیا جس کو لارڈ صاحب نے

بخوشی منظور کیا۔ اس خوشی میں نواب محمد سعید خاں صاحب نے دربار کیا اور ولی عہد کو سب سے نظریں دلوائیں۔ حکیم احمد خاں صاحب فاخر نے تاریخ ولی عہدیہ فرمائی۔ ؎

مثل مہ کنعانی آں یوسفِ لاثانی	شد زیب دہ مسند با چہرۂ نورانی
از حضرت اعلیٰ ہم تشریفِ ولی عہدی	آں زبدۂ دولت را گردید چو ارزانی
ہر پارچۂ انور چوں مہر درخشاں بود	از گوہر عمانی، وز لعل بدخشانی

تشریف ولی عہدی پوشید چو شاہانہ
تاریخ ہمایونش، شد خلعت سلطانی

نواب محمد سعید خاں صاحب نے نواب محمد یوسف خاں کو اپنی زندگی میں ریاست کا انتظام و اہتمام سپرد کر دیا تھا۔ عیدین کی نماز کے جلوس کے ساتھ ان کو بھیجا جاتا تھا۔ ان کی اطاعت و تابعداری سے بہت خوش و رضامند تھے۔ انتقال سے قبل نواب سید محمد سعید صاحب نے اپنے ولی عہد کو حسب ذیل وصیت کی۔

• فرزند یوسف! دنیا میں کسی کے ماں باپ ہمیشہ زندہ نہیں رہے ہیں اور میں جانتا ہوں کہ میرے انتقال کا وقت قریب ہے اور مرض ترقی پر ہے مگر اے فرزند میں تم کو جو وصیتیں کرتا ہوں ان پر عمل کرنا تاکہ حکومت آرام سے کرو۔

جملہ کاروبار ریاست بذات خود جس طرح میں نے انجام دیتے ہیں، اس طرح انجام دینا اور رعایا کے حال سے غافل نہ ہونا اور ملک کے حالات سے واقف ہونا تمہارا فرض ہے۔

برٹش گورنمنٹ اور سرکار انگلیشیہ کی اطاعت اپنا آئین بنانا اور ہر حال

میں ان سے دلی دوستی رکھنا۔ ارباب خاندان کے ساتھ سلوک سے پیش آنا اور جو ہدایات اور چٹھیاں اہل خاندان کے بارے میں حکام انگریزی نے دی ہیں ان کو اپنے پیش نظر رکھنا"

نواب یوسف علی خاں یہ وصیتیں سنکر رونے لگے۔ نواب نے فرمایا یہ محل و موقع رونے کا نہیں ہے اسی راستے آج ہمیں اور کل تمہیں ضرور چلنا ہے۔ جب نواب صاحب نے انتقال کیا تو نواب یوسف علی خاں نے قدیم قاعدے کے مطابق ہتھیار (تلوار) اور خزانہ کی کنجی پر قبضہ کیا۔ ۹ اپریل ۱۸۵۵ء مطابق ۲۱ رجب ۱۲۷۱ھ کو الگزینڈر صاحب ایجنٹ ریاست و کمشنر رامپور آئے اور ۱۰ اپریل ۱۸۵۵ء کو نواب یوسف علی خاں کی رسم مسند نشینی ادا کی۔

سید مہدی علی خاں نے اپنی بیگم کی طرف سے ریاست کے خلاف دعویٰ دائر کیا جس کو گورنمنٹ نے منظور نہیں کیا۔ جب مسند نشینی ہوئی تو اس میں نواب مہدی علی خاں شریک نہیں ہوئے۔ اس پر نواب یوسف علی خاں نے ان کو لکھا کہ "ہم مسند نشین ہوئے تم ہماری نذر کے واسطے کیوں نہیں آئے" انہوں نے جواب میں کہا میں اس لئے حاضر نہیں ہو سکا کہ مجھے کلکتہ وغیرہ جانا ہے اس لئے مجھ کو دو سال کی رخصت مرحمت کی جائے۔ مہدی علی خاں شعبان ۱۲۷۲ھ کو کلکتہ روانہ ہوئے اور وہاں سے لندن پہنچے اور اپنے حقوق کا وہاں دعویٰ کیا جو خارج ہوا۔ مئی ۱۸۵۸ء کو جب وہ کلکتہ واپس پہنچے تو حکومت نے اس وجہ سے کہ اگر یہ ریاست میں پہنچ گئے تو فتنہ و فساد کھڑا کر دیں گے ان کو فورٹ ولیم میں نظر بند کر دیا۔ اور ایجنٹ نے نواب یوسف

علی خاں سے دریافت کیا کہ سید مہدی علی خاں کلکتہ میں بغاوت کے شبہ میں روک لئے گئے ہیں ان کو نظر بند کر دیا گیا ہے اگر ان کو رامپور بھیجدیا جائے تو کوئی ہرج تو نہیں ہوگا۔ نواب صاحب نے جواب دیا باغیوں کی گرفتاری اور سورش وہنگامہ فرو ہونے تک ان کا یہاں آنا مناسب نہیں ہے۔ چنانچہ سید مہدی علی خاں اس وقت تک نظر بند رہے جب تک ریاست میں مکمل امن وامان نہیں ہوگیا۔

روہیل کھنڈ کی جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے سب سے بڑے دشمن نواب یوسف علی خاں تھے۔ انہوں نے جنگ آزادی میں قدم قدم پر رکاوٹیں ڈالیں اور پیدا کیں۔ اور ہر طرح سے جنگ آزادی کو ناکام کرنے کی کوشش ہی نہیں کی بلکہ اپنی فوج وطاقت قوت سے ناکام کرنے میں کامیاب ہوئے۔ مجاہدین کے یہ سخت ترین دشمن تھے۔ انگریز کی دوستی میں مجاہدین کو نقصان پہنچانا ان کی جان ومال کی پرواہ نہ کرنا ان کو مچھروں اور بھنگوں کی طرح ملنا، انگریزی حکام اور اس کی فوج کی ہر طرح سے مدد کرنا ان کی جان ومال کی حفاظت کرنا، اپنا دین وایمان سمجھتے تھے۔ مجاہدین کی کامیابی ان کو کھٹکتی تھی ان کی کامیابی پر ان کے ہاں ماتم بپا ہو جاتا تھا۔ یہی نہیں بلکہ احسان فراموش بھی تھے۔ حافظ رحمت خاں کے خاندان کے بزرگوں اور لوگوں کے ان کے خاندان پر جو احسانات تھے اور ساتھ انتہائی قریبی تعلقات ودوستی تھی انہوں نے اپنی خود غرضی اور انگریز دوستی پر ان کو قربان کر دیا اور مجاہدین کے سردار اور روہیل کھنڈ کی جنگ آزادی کے ہیرو خان بہادر خاں اور ان

کے ساتھیوں کے خون کے پیاسے بن گئے تھے۔ خان بہادر خاں صاحب کا نام ان کے لئے سوہان روح تھا۔

رہیل کھنڈ میں ایک فرد واحد نواب یوسف علی خاں ہی تھے جن پر انگریزی افسران کو مکمل اعتماد تھا اور یہ ان کے جاں نثار تھے۔ ۱۱ رمئی ۱۸۵۷ء کو جب کہ ایک سوار کے ذریعہ میرٹھ میں جنگ آزادی کی ابتدا ہونے کی خبر مرادآباد میں آئی تو آگ کی طرح چاروں طرف پھیل گئی۔ انگریزی افسران کو بھی اس کی اطلاع ہوئی تو پیٹ پکڑے ہوئے مسٹر جی۔ سی ولسن جج علی الصباح رامپور پہنچے اور نواب یوسف علی خاں سے تبادلۂ خیال کر کے مرادآباد واپس آئے۔

۱۸ رمئی کو سفر مینا کی پلٹن کے ستر کے قریب فوجیوں نے گاگن کے پل مرادآباد پر جمع ہو کر جنگ آزادی کا بگل بجایا جس سے مرادآباد کے اطراف کے لوگوں میں اور مستعدی پیدا ہوئی۔

۱۲ رمئی کو تقریباً دو سو غازیوں کا غول رامپور سے مرادآباد پہنچا۔ ان کو مولوی منّو نے بلوایا تھا۔ ولسن صاحب ۲۹ نمبر کی پلٹن کے چند سپاہی اور سواروں کو لیکر رام گنگا کے کنارے مقابلہ کرنے کے لئے پہنچے اور غازیوں پر حملہ کر دیا۔ ایک غازی شیر بچہ بھر کر ولسن صاحب پر چھوڑنا چاہتے تھے کہ ایک انگریز سپاہی نے ان کو مار ڈالا۔ اور مولوی منّو کو پولس نے گرفتار کر کے سرِ شام گولی کا نشانہ بنا کر شہید کر دیا اور کچھ آدمی گرفتار ہوئے۔

مجاہدین کو قید کرنے کے لئے انگریزوں کے پاس کوئی انتظام نہیں تھا۔ نواب یوسف علی خاں مرادآباد پہنچے ہوئے تھے، ان کے سپرد یہ مجاہد کئے

گئے اور نواب صاحب نے ان مجاہدوں کو اپنے ولی عہد نواب کلب علی خاں کے سپرد کر دیا۔ جیل میں مقید ہوئے اور ان کے ہاتھوں گولیوں کا نشانہ بنے۔

۳۱ مئی ۱۸۵۷ء کو جب کہ محمد بخش عرف بخت خاں صوبیدار توپ خانہ مع پلٹن ۱۸ اور ۶۸ پیادگان ہندوستانی اور آٹھویں رجمنٹ ہندوستانی نے بریلی میں بغاوت کا آغاز کیا اور انہوں نے میگزین اور خزانہ سرکاری اپنے قبضہ میں کر لیا۔ جیل خانہ توڑ کر قیدیوں کو رہا کر دیا اور انگریزی افسران نینی تال چلے گئے اور اسی دن خان بہادر خاں وغیرہ نے اپنی حکمرانی کا اعلان کر دیا۔ انگریز قتل ہوتے مجاہدین بھرتی ہونے لگے کارتوس ڈھلنے لگے اور رامپور کے غول کے غول خان بہادر کے ہمنوا بن کر فوج میں شرکت کرنے لگے۔ بریلی کے حالات سنکر مرادآباد میں بھی یہی عمل ہونا شروع ہوا۔ مجوخاں ہندوستانی باغی پلٹن کے افسر بنائے گئے اور اسد علی خاں توپ خانہ کے افسر مقرر ہوئے نواب صاحب کو بہت رنج و افسوس ہوا۔ انہوں نے اپنے ولی نعمت انگریز افسران کو مطلع کیا کہ اپنی جان مال کی حفاظت کریں۔ حالات خطرناک ہیں۔

نواب صاحب مرادآباد اور بریلی کے واقعات و قبضہ مجاہدین سے بہت متاثر ہوئے انہوں نے سمجھ لیا کہ اگر مجاہدین اسی طرح اپنی بہادری کے جوہر دکھاتے رہے اور ان ضلعوں پر زیادہ دیر تک پاؤں جمائے تو اس پر انگریزوں کا دوبارہ قبضہ ہونا بہت مشکل ہو گا۔ اس لئے انہوں نے بریلی کے کمشنر کو جو نینی تال چلے گئے تھے، لکھا کہ مجاہدین نے پاؤں جمانے کی ابھی ابتدا کی ہے رعایا ان کی ہمنوا بن گئی ہے۔ ان کو ابھی کسی دوسری جگہ سے مدد نہیں ملی ہے۔

عوام انگریزوں کے خلاف فی الحال بہت جذبہ رکھتے ہیں ان کی قوت و اثر توڑنے کا بہتر طریقہ یہ ہے کہ میں مسلمان نواب ہوں میں اپنی حکومت قائم کروں عوام فریب میں آجائیں گے کہ ہندستانیوں کی حکومت قائم ہوگئی۔

نواب یوسف علی خاں کے پاس نینی تال سے کوئی جواب نہیں آیا انہوں نے اس کا مزید انتظار کئے بغیر صاحبزادہ سید عبدالعلی خاں عرف منجھلے صاحب کو جوان کے حقیقی چچا تھے، ایک فوج کے ساتھ مرادآباد روانہ کیا یہاں کا ناظم حکیم سعادت علی کو مقرر کیا۔ ان کو معلوم ہوا کہ رام پور سے صاحبزادہ سید باقر علی خاں برادر صاحبزادہ سید مہدی علی خاں سو سوا سو آدمیوں کے ہمراہ مرادآباد کی حکومت پر قبضہ کرنے کے ارادے سے جانے والے ہیں، حکیم صاحب ان کے جانے سے قبل ہی مرادآباد پہنچ گئے اور رام گنگا کے گھاٹوں پر قبضہ کرلیا۔ سید باقر علی کو نامراد واپس آنا پڑا۔ اسی روز آدھی رات کو حکیم سعادت علی خاں کچھ نوکروں کے ساتھ مرادآباد آگئے۔ جیل خانہ کو دیکھا۔ سید موسیٰ رضا جیلر کو تسلی و تشفی دی کہ گھبراؤ نہیں علی الصباح میں منجھلے صاحب کے ساتھ آؤں گا شہر کا انتظام سنبھال لیا جائے گا۔ چنانچہ جب سید عبدالعلی خاں اور حکیم سعادت علی خاں توپ خانہ اور کثیر فوج کے ساتھ صبح مرادآباد پہنچے تو اس وقت مجدالدین احمد خاں عرف مجو خاں اور عباس علی خاں نبیرہ نواب دوندے خاں حکمرانی کر رہے تھے۔ چالاکی سے ان کی حکومت ختم کی اور اعلان کرایا کہ شاہی حکومت قائم ہوگئی ہے جس کے منتظم نواب رام پور ہیں۔ کچہریوں کے تمام ملازموں کو اپنی اپنی جگہ پر کام کرنا چاہئے اگر ان سے کوئی خطا و

قصور سرزد ہوا ہے تو بدلہ نہیں لیا جائے گا۔"

اس اعلان کے بعد سید عبدالعلی کے دربار میں تمام انگریزی ملازم تنخواہیں لینے کے لئے آئے۔ مجاہدین کا اثر ان کی طاقت کے مقابلہ میں زیادہ تھا اس لئے مجاہدین کے حامیوں کے ساتھ سخت برتاؤ نہیں کیا گیا۔ کوتوال وغیرہ اپنے مقرر کئے اور جو عورت و مرد مجو خاں کے پاس قید تھے ان کو اپنی حفاظت میں لے لیا اور کانش والے مکان میں بڑے آرام آسائش کے ساتھ رکھا ان کی حفاظت کے لئے فوج کا پہرہ بٹھا دیا اور فی کس پانچ روپے خوراک کے مقرر کئے۔

۶ جون کو انگریزی حکومت کی طرف سے حکمنامہ آیا کہ مراد آباد کے ضلع پر اپنی حکومت قائم کر سکتے ہو۔ چنانچہ اسی روز نواب محمد یوسف علی خاں رامپور سے مراد آباد آئے۔ ان کے پہنچتے ہی توپوں کی سلامی ہوئی۔ انہوں نے درباریوں کو دوشالے انعام میں دیئے۔ دو ہزار روپیہ مجاہدین میں تقسیم کرایا۔ دربار نواب صاحب کی کوٹھی پر قائم ہوا تھا۔ عوام میں پورا اعتماد حاصل کرنے اور بغاوت کو ٹھنڈا کرنے کے لئے اسی دربار میں مجو خاں کو مراد آباد ضلع کا ناظم مقرر کیا۔ حکیم سعادت علی خاں جج اور نیاز علی ڈپٹی کلکٹر مقرر ہوئے۔

نینی تال انگریزوں کی امن گاہ تھی وہاں کافی انگریز مرد عورت چلے گئے تھے لیکن بے سروسامان تھے انگریز جنگ میں کافی روپیہ خرچ کر رہا تھا یہاں بھی امداد پہنچی تھی لیکن ناکافی ہوئی تھی اور مجاہدوں نے ان کے رسد کے راستے بند کر دیئے تھے۔ نواب سید یوسف علی خاں کو جب یہ حالت

معلوم ہوئی تو انہوں نے چار ہزار اشرفیاں نینی تال کے کمشنر کے پاس بھیجیں۔
جب خاں بہادر کو نواب یوسف علی خاں کی اس شرارت اور مکر کا علم ہوا تو انہوں نے نواب صاحب کی حیثیت سے ہر ایک مجاہد کو آگاہ و واقف کرانا ضروری سمجھا۔ ان کو بتلایا ہی نہیں بلکہ اچھی طرح ذہن نشین کرا دیا کہ یوسف علی خاں انگریزوں کے بہت بڑے حامی ہیں رات دن یہ سوچتے رہتے ہیں کہ جنگ آزادی ناکام ہو اور مجاہدوں کو موت کے گھاٹ اتار دیں۔ خان بہادر خاں نے مجاہدوں کو اس حقیقت سے بھی روشناس کرایا کہ اگر اس جنگ آزادی میں نواب رامپور اپنا قدم نہ اڑائیں، انگریزوں کی حمایت نہ کریں اور ان کی حفاظت کے لئے جتن نہ کریں تو انگریزوں کا نام و نشان بھی باقی نہیں رہے۔ نواب صاحب انگریزوں کی سامان سے مال سے فوج سے ہر صورت سے مدد کرتے ہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ اس خطرناک و سازشی کانٹے کو راستے سے دور کر دو پھر تمہاری حکومت پورے رہیل کھنڈ پر ہو گی اور اس کے بعد تم بادشاہ دہلی کی بھی پوری حمایت و اعانت کر سکتے ہو۔ اس وقت بہت اچھا موقع ہے کہ ریاست میں نہ تمہارے مقابلہ کی فوج ہے نہ سامان جنگ ہے۔ حملہ کر دو اور شمسہ تاجدار بیگم بنت نواب سید احمد علی خاں کو جو ریاست کی مستحق ہیں رامپور کا حکمراں بنا دو۔ اگر رام پور تمہارے قبضہ میں آگیا اور اس پر حکومت ہو گئی تو پھر نینی تال والوں کو سزا دینا تمہارے لئے کوئی مشکل نہیں ہے بلکہ میرٹھ تک تمہارا راستہ صاف ہے اور دہلی کی راہ میں جو خطرے ہیں وہ ناپید ہو جائیں گے۔"

اس تقریر سے مجاہدین کی آنکھیں کھل گئیں اور انہوں نے رامپور پر حملہ کرنے کی ٹھان لی۔ اس سکیم کو کسی نے نواب یوسف علی خاں صاحب تک پہنچا دیا تھا نواب صاحب بہت پریشان ہوئے اور تمام طاقت کو ایک جگہ جمع کرنے میں لگ گئے۔ مراد آباد کی فوج کو رامپور میں بلایا عبدالعلی خاں اس فوج کے ہمراہ تھے۔ رامپور کے باشندے بھی جنگ آزادی کے حامی تھے رامپور میں اس وقت بارہ تیرہ ہزار فوجی سپاہی تھے لیکن نواب صاحب کو کسی پر اعتماد نہیں تھا۔

۹ جون کو مجاہدین شہر گنیش گھاٹ کے باہر ٹھہرے۔ جب بہت بڑی تعداد میں فوج یہاں آکر جمع ہو گئی تو فوج نے نواب صاحب کے حامیوں کے سامنے یہ بات رکھی کہ تم انگریزوں کے حامی ہو اور ہمارے دشمن ہو ہماری تباہی کے ہر وقت منصوبے بناتے ہو۔ نواب صاحب کو ہمارے ساتھ چلنا چاہیئے۔ اگر چل نہیں سکتے تو اپنی فوج ہم کو دیں تاکہ ہم نینی تال کے انگریزوں کو جہنم واصل کریں اور ولی عہد نواب کلب علی خاں کو ہمارے ساتھ بہادر شاہ ظفر کی فوج میں بھرتی ہونے کے لئے روانہ کرو۔ اگر نواب صاحب ان باتوں پر عمل کریں گے تو ہم سمجھیں گے کہ نواب صاحب غلامی کی لعنت کے مخالف اور جنگ آزادی کی کامیابی کے خواہاں ہیں۔

نواب یوسف علی خاں صاحب نے مولوی سرفراز علی صاحب (مجاہد اکبر) کی معرفت مجاہدوں سے یہ گفتگو کی۔ یہ فوج دہلی کے لئے روانہ ہونے والی تھی دہلی کو فتح کرنے کی متمنی تھی اور فتح کے لیے جن چیزوں کی ضرورت تھی وہ اسلحات

اور پیسہ ان کے پاس تھا۔ نواب صاحب نے سات ہزار روپے دیکر ان کو ٹالا۔ یہ لوگ روپیہ لیکر دہلی پہنچے اور بہادر شاہ کی خدمت میں وہ رقم پیش کر دی۔

دوسروں سے ہمدردی کرنا ان کی عزت و آبرو کو بچانا بعد کی چیز ہے انسان اپنی عزت آبرو جان و مال کو بچانا مقدم سمجھتا ہے۔ چنانچہ رامپور پر حملہ کرنے کی خبر جب نواب رامپور نے سنی تو مراد آباد کی فوج کو رامپور کی حفاظت کے لئے بلالیا۔ مجاہدین نے یہ موقع غنیمت سمجھا اور مجوخاں نے مراد آباد میں اپنا سکہ جمایا۔ عیسائیوں کو پکڑ کر گاڑیوں سے باندھ کر کیمپ میں پہنچایا جن لوگوں کو نواب رامپور کی حکومت نے گرفتار کیا تھا انھوں نے ان کو رہا کیا۔ انگریز مجسٹریٹ اور پادریوں کو قتل کیا۔ ۱۸ جون کو مجوخاں شاہ دہلی کے نائب مقرر ہوئے اور عوام نے بھی ان کو اپنا حاکم بخوشی تسلیم کر لیا۔

نواب سید یوسف علی خاں چین سے نہیں بیٹھے تھے مجاہدوں کے اقتدار سے چراغ پا ہوجاتے تھے، مراد آباد میں ان کی حکومت کیسے برداشت کرتے انگریزی فوجی افسران کے پاس پہنچے اور مراد آباد کے لئے فوج طلب کی چنانچہ کمشنر نے دو ہزار سپاہی اور چار توپیں صاحبزادے عبدالعلی خاں اور حکیم سعادت علی خاں کے ہمراہ کیں۔ ۲۴ جون کو یہ فوج مراد آباد پہنچ گئی مجوخاں کے پاس فوج بہت کم تھی دو توپیں اور کچھ سپاہی تھے۔ نواب رامپور نے ان کو ڈرا دھمکا کر حکومت سے دستبردار ہونے پر مجبور کیا۔ وہ حالات دیکھ کر راضی ہو گئے۔ نواب یوسف علی خاں کو پہلے ہی مجاہدین سے حکومت چھیننے

کا تجربہ ہو چکا تھا اس لئے مجو خاں کے تالیف قلوب کے لئے اور عوام کو بھی مطمئن کرنے کے لئے نواب مجو خاں کو سنبھل کا ناظم مقرر کیا اور ساٹھ ہزار روپے کی جاگیر دی تھی۔ مجو خاں کے پاس انگریزی مرد عورت تھے وہ ان سے نواب یوسف علی خاں نے لے لئے اور ان کی رہائش کے لئے نواب صاحب نے معقول بند و بست کیا۔ اس کے باوجود ضلع میں انگریزوں کا کشت و خون جاری تھا۔ مجاہدین کا پورے ضلع مراد آباد پر قبضہ تھا۔ نواب ولی داد خاں حسن پور تک پہنچ گئے تھے۔ ٹھاکر دوارے میں انگریزوں کے حامیوں کا قلع قمع ہو رہا تھا ان کو جیل خانوں میں بھیجا جا رہا تھا اور ان سے مجاہدین کو ستانے کے بدلے لئے جا رہے تھے۔ سنبھل کی بھی یہی حالت تھی۔ صاحب سنگھ اور چھد وکھوری انگریزوں کے خون کے پیاسے تھے لیکن عوام کے ہمدرد اور بہی خواہ تھے۔

مجاہدین کی طاقت و قوت کو توڑنے اور انگریزی حکومت کو دوبارہ مراد آباد میں قائم کرنے کے لئے نواب یوسف علی خاں نے عبد العلی خاں کو مراد آباد کا حاکم اعلیٰ مقرر کیا۔ غلام ناصر خاں کو ڈپٹی کلکٹر اور شہر کے انتظام کے لئے سید موسیٰ رضا عرف بھورے خاں کو توال بنایا گیا۔

موضع پتی پر وہاں کے ٹھاکر چھائے ہوئے تھے انہوں نے انگریزوں کے تمام راستے بند کر دیئے تھے۔ مختلف مقامات سے کافی لوگ ان کے ساتھ ہو گئے تھے۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ نواب یوسف علی خاں نے مراد آباد اور غازی آباد پر دوبارہ قبضہ کیا ہے اس کو ختم کیا جائے اور اپنی حکومت قائم کی جائے۔

نواب رامپور نے ان ٹھاکروں کے زور کو توڑنے کے لئے غلام ناصر خاں کو سواروں پیادوں اور توپ خانہ کے ساتھ موضع پتیئی روانہ کیا۔ اس نوابی فوج نے ہندوستانیوں پر بہیمانی ظلم ڈھانے شروع کئے جس کو چاہتے پکڑ لاتے اور عورتوں کے زیورات تک چھین لیتے تھے اور مجاہدوں کو گرفتار کر کے مینجلے صاحب کے حکم سے ان کے ہاتھ کٹوا دیتے تھے۔

سنبھل میں موضع لکھوری کے جاٹ جن کے سرغنہ صاحب سنگھ اور جھد و تھے ہیراپور کے میواتی اور بلال پور کے مولوں نے ان کے ساتھ مل کر سنبھل کی سرکاری عمارتوں کے بڑے حصہ کو لوٹا غارت کیا۔ نواب رامپور نے سنبھل میں اپنی فوج بھیجی اور مجاہدین کو گرفتار کر کے توپوں سے اڑایا۔ حسن پور میں ایک جانب نواب ولی داد خاں انگریزوں کے لئے مصیبت بنے ہوئے تھے تو دوسری طرف جاٹوں نے شورش برپا کر رکھی تھی۔ نواب رامپور نے فوراً صاحبزادہ سید محمد رضا خاں جو نواب رامپور کے داماد تھے ان کو اور اپنے بھتیجوں کو دو توپوں کے ساتھ حسن پور روانہ کیا۔ مجاہدین نے ان سے مقابلہ کیا۔ نوابی فوج نے مجاہدین کو کچلا قتل کیا چاروں طرف سے بمباری کی۔ کمزور تھے شکست پائی۔

ٹھاکر دوارہ میں مجاہدین سے مقابلہ کرنے کے لئے نواب یوسف علی خاں نے عبدالرحمٰن خاں رسالدار اور علی رضا خاں رسالدار خاں کو دو سو سواروں اور توپوں کے ساتھ روانہ کیا۔ دریا ڈھیلا پر تین ہزار مجاہدین نے ان سے مقابلہ کیا۔ رام پوری سوار کافی مارے گئے۔ مجاہدین کے پاس توپیں

نہیں تھیں اس لئے صحیح طریقے سے مقابلہ نہیں کر سکے۔ نوابی فوج نے توپوں سے۔ ۔ ۔ حملہ کیا تو ٹھاکردوارے کا کچھ حصہ ان کے قبضہ میں آگیا۔ مرادآباد کے ایک مشہور رجا نباز مجاہد، جب مرادآباد کا جیل خانہ ٹوٹ گیا اس وقت جیل سے رہا ہو کر ٹھاکردوارے آئے تو انہوں نے انگریزوں کو یہاں سے بھگایا ان کی کوٹھیاں نذر آتش کیں ان کا سامان لوٹا۔ اس عرصہ میں ان کے ساتھ گرد و نواح کے امیر اور دوسرے لوگ انگریزوں کے خلاف لڑنے کے لئے متحد و متفق ہوئے۔ مجاہدین کی چار ہزار فوج نے موضع شریعت نگر کے انگریزوں کے بہی خواہوں کو لوٹا۔ عبدالرحمٰن خاں، علی رضا سوار اور توپیں لے کر ان مجاہدین پر حملہ کرنے کے لئے گئے۔ کافی دیر زبردست جنگ ہوئی نوابی فوج کے سپاہی مارے گئے مجاہدین بھی پسپا ہوئے۔ اس لڑائی کے بعد ٹھاکردوارہ پر نواب یوسف علی خاں کا مکمل قبضہ ہو گیا۔

۲ر نومبر ۱۸۵۷ء کو گلزار علی صاحب اور ماڈھے خاں کا امروہہ پر مکمل قبضہ ہو گیا تھا۔ مجاہدین کی فوج بھی کافی بڑی بن گئی تھی۔ نواب صاحب یوسف علی خاں بے چین و بے قرار ہو گئے۔ مجاہدین کی حکومت کو ختم کرنے کے لئے حکیم سعادت علی خاں، غلام ناصر خاں اور خان وزیر علی خاں خانساماں کی زیر کمان ایک فوج امروہہ سے روانہ کی۔ مقابلہ انتہائی سخت ہوا دونوں طرف سے لوگ مارے گئے۔ گلزار علی نے جب اپنے آپ کو بیحد کمزور پایا تو انہوں نے امروہہ چھوڑ دیا۔ نوابی فوج نے مجاہدین کے مکانوں کو منہدم کیا اور مجاہدین کو توپوں سے اڑا دیا۔

روہیل کھنڈ کے علاقہ کے تقریباً تمام انگریز مختلف مقامات سے فرار ہو کر نینی تال میں مقیم ہو گئے تھے۔ نواب یوسف علی خاں ان کو کھانے پینے، پہننے اور اوڑھنے کا سامان نینی تال بھجوایا کرتے تھے۔ مجاہدین کیسے گوارا کر سکتے تھے کہ ان کے دشمنوں کو سامان روانہ کیا جائے۔ انہوں نے اس میں رکاوٹ ڈالنے کے لئے اپنے آدمی مقرر کئے۔ جولائی ۱۸۵۷ء میں نواب رامپور نے کمبل اور کوٹ وغیرہ اور کچھ کھانے کی چیزیں شیخ علی بخش کے ذریعہ کمشنر نینی تال کے پاس بھجوائیں یہ سواروں کے ساتھ لیکر کالا ڈھونگی روانہ ہوئے۔ مجاہدین نے ان کا سامان لوٹنے کے لئے ایک مورچہ قائم کر رکھا تھا علی بخش نے جب یہ حالت دیکھی تو رامپور واپس لوٹے اور وہاں سے فوج کے ساتھ سامان لیکر روانہ ہوئے۔ تب نینی تال سامان پہنچا۔ ایک مرتبہ علی بخش دس بارہ گاڑیاں سامان رسد کی کمشنر نینی تال کو دیکر آیا۔ جب وہ سامان ایک گارد شفا خانہ سے لے کر چلا تو خان بہادر خاں کی فوج نے وہ سب لوٹ لیا۔

صاحبزادہ سید عبدالعلی خاں عرف منجھلے صاحب مراد آباد کے ناظم بنے ہوئے تھے۔ ان کی نظامت کے زمانے میں کوئی دن بھی ایسا نہیں گذرا جو مجاہدین نے مراد آباد میں ان کے خلاف کوئی نہ کوئی حرکت نہ کی ہو۔ نواب رامپور کو ایک دن اطلاع ملی کہ فیروز شاہ جو دہلی کا ایک شہزادہ ہے وہ سنبھل سے ہوتے ہوئے مراد آباد اور رامپور آنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ نواب رامپور نے ان کو روکنے کے لئے بہت کوشش کی لیکن ناکام ہوئے اور فیروز شاہ ۲۲ اپریل ۱۸۵۸ء مطابق ۱۷ رمضان ۱۲۷۴ھ کو مراد آباد میں داخل ہو گئے اور عید گاہ

کے قریب ٹھہرے۔ منجھلے صاحب نے شہر والوں کی رائے معلوم کی۔ انہوں نے بتایا کہ فیروز شاہ کا ساتھ دیں گے۔ غلام ناصر خاں اور سید موسیٰ رضا خاں اور مولوی شاہ علی مراد آبادی کو فیروز شاہ کے پاس بھیجا گیا۔ شہزادہ گفتگو کر رہا تھا کہ اس کی فوج نے ان لوگوں سے توپیں چھین لیں۔ فیروز شاہ کے ساتھی انگریزی فوج کے سدھائے ہوئے لوگ تھے جو جنگی قواعد سے واقف تھے مجاہدین کی فوج بہت زیادہ تھی۔ رامپوری فوج جنگی اصولوں سے ناواقف ہی نہیں بلکہ نوادر تھی تعداد میں بھی کم تھی۔ فیروز شاہ کی طاقت کو دیکھ کر منتشر ہو گئی غالب علی خاں نے منتشر ہونے کی ابتدا کی۔ نوابی حکام نے قصائیوں کے چودھری سے اپنی حمایت کے لئے کہا اس نے صاف انکار کر دیا۔ خوفناک اور پر آشوب حالات دیکھ کر منجھلے صاحب کے صاحبزادے سید ہدایت علی ان کو ہاتھی پر بٹھا کر مراد آباد سے لے گئے۔ فیروز شاہ کی فوج تمام مراد آباد میں پھیل گئی۔ جن لوگوں پر انگریزوں کے حامی ہونے کا شبہ ہوتا یا نواب رام پور کے آدمی ظاہر ہوتے ان کی جان کی خیر نہیں تھی۔ فیروز شاہ کے ساتھ شہر کے ہندو مسلمان بہت ہو گئے تھے۔ انہوں نے ایک عہد نامہ مرتب کیا تھا جس پر مراد آباد کے سولہ ہزار آدمیوں نے جنگ آزادی میں شامل ہونے کے لئے بحلف دستخط کئے تھے۔

نواب یوسف علی خاں کو فیروز شاہ کے مراد آباد پر قبضہ کرنے کا بہت رنج و افسوس ہوا تھا انہوں نے دو وقت کھانا نہیں کھایا تھا اور ۲۳ اپریل ۱۸۵۸ء کو فوج روانہ کرنے کا حکم دیا۔ سات ہزار فوج رامپور سے پورے انتظام کے ساتھ مراد آباد روانہ ہوئی مگر بھیڑے کے پل تک پہنچتے پہنچتے فوج آدھی

رہ گئی تھی۔ سپاہی بندوق کا دستہ درخت کے تنے میں زور سے مار کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیتے تھے پھر بندوق پھینک کر رامپور کی طرف چلے جاتے تھے۔ بچی کچی فوج علی الصباح رام گنگا کے کنارے پر پہنچی۔ فیروز شاہ پہلے سے ہی ہوشیار تھے ان کے مخبر رات دن نواب رام پور کی فوج وغیرہ کی خبریں پہنچاتے تھے۔ رام پوری فوج کی روانگی کی اطلاع ان کو مل چکی تھی انہوں نے فوج کو تیار رہنے کا حکم دیا تھا فیروز شاہ کو کسی قسم کا خوف نہیں تھا تمام شہر ان کے ساتھ تھا قواعد جنگی سے واقف چار پانچ ہزار فوج ان کے ہمراہ تھی انہوں نے تین مورچے ایک شاہ بلاقی کے مزار کے متصل، ایک قلعہ پر اور تیسرا دونوں مورچوں کے درمیان قائم کئے تھے۔ نواب رامپور کی فوج نے بھی تین حصوں پر فوج منقسم کی تھی۔ ایک حصہ خاکی ڈویژن کا جس میں صاحبزادہ سید کاظم علی خاں کی فوج بھی شامل تھی اس نے اپنا مورچہ قلعہ کے محاذ پر لگایا۔ ایک ڈویژن نے زیارت کے مورچہ کے سامنے توپیں کھڑی کیں جس کے نگراں حکیم سعادت علی خاں تھے۔ ایک فوج کا حصہ درمیانی مورچے کے محاذی تھا اس کے افسر چھوٹے صاحب تھے۔

۲۴ اپریل ۱۸۵۸ء کو نواب کی خاکی ڈویژن نے مجاہدین پر گولہ باری شروع کی۔ تینوں مورچوں پر حملوں کا سلسلہ برابر جاری ہو گیا تھا۔ کافی عرصہ کے بعد مجاہدین نے نوابی فوج کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ حکیم سعادت علی خاں بھی بے بس ہو گئے۔ سمندر خاں اور وزیر علی خاں وغیرہ زنبورچی اور کافی رامپوری فوج ماری گئی۔ جب نوابی فوج کے سوار زخمی ہو کر گھوڑے سے گرتے

تھے تو ان کی کوبخیں مار دیتے تھے تھوڑی دیر تک تو نوابی فوج اس خیال میں کہ ہماری مدد کے لئے اور فوج آئے گی، پڑی رہی لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ مجاہدین کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے اور ہماری مدد کے لئے کوئی نہیں آیا ہے تو انہوں نے راہ فرار اختیار کی۔ جب تھوڑی دیر میں نوابی فوج کچھ جمع ہو گئی تو فیروز شاہ اسی مقام پر اپنے سواروں کے ساتھ آیا اور اس نے رامپوری فوج کو مخاطب کر کے کہا۔

"افسوس تم مسلمان ہو کر ہماری جان کے درپے ہو اور کفار کی حمایت میں ہم کو تکلیف دینا گوارا کرتے ہو۔"

نوابی فوج نے کوئی معقول جواب نہیں بلکہ بے غیرتی اور بے شرمی کا جواب دیا کہ ہم تو مسلمان رئیس کے ملازم ہیں اور تم سے اس واسطے مقابلہ کیا جاتا ہے کہ تم غیر کے حق کو غصب کرتے ہو۔

جنگ کا سلسلہ کچھ دیر کے لئے جاری ہوا۔ فیروز شاہ کو معلوم ہوا کہ بہت بڑی تعداد میں انگریزی فوج جنرل جونس کی قیادت میں آ رہی ہے، یہ دریائے گانگن کے کنارے جا کر ٹھہرے۔ دن کے بارہ بجے لڑائی موقوف ہوئی۔ فیروز شاہ کا نوابی فوج اور ان کے افسروں پر اتنا رعب تھا کہ شہر میں بہت کھوج اور تلاش کے بعد جب یہ یقین ہو گیا کہ فیروز شاہ شہر میں نہیں ہے جب شہر میں داخل ہوئے۔ ۲۴ اپریل ۱۸۵۸ء کو نواب محمد سعید خاں کے حکم سے مراد آباد کی حکومت جنرل جونس کے حوالے کی گئی اس نے مجاہدین کو تہ تیغ کیا اور عرصہ تک درختوں وغیرہ پر مجاہدین کو پھانسیاں دی جاتی رہیں۔

بابو رام نرائن نے اسلام نگر میں انگریزوں کے خلاف علم بغاوت بلند کیا چونکہ مرادآباد میں انگریزوں کا قبضہ ہو گیا تھا نواب رام پور نے وہاں مداخلت نہیں کی لیکن کمشنر نے ان کو لکھا کہ ہم کو بہت ضروری کام انجام دینے ہیں، آپ رام نرائن کی قوت کو توڑنے کا بندوبست کریں۔ اس حکم کی تعمیل نواب صاحب نے کی اور حکیم سعادت علی خاں کے زیر کمان ایک فوج اسلام نگر پہنچی ۲۹ مئی ۱۸۵۸ء کو بابو رام نرائن کی فوج سے مقابلہ ہوا۔ کہاں رام نرائن اور کہاں نواب رامپور کی طاقت غریب کو شکست ہونی تھی وہ ہوئی اور رام نرائن اپنے ساتھیوں کے ساتھ نواب محمد یوسف خاں کی فوج کی گولیوں کا نشانہ بن کر ختم ہوئے۔

نواب یوسف علی خاں نے رہیل کھنڈ کے اہم مقامات رام پور، بریلی اور مرادآباد کے قصبوں وغیرہ کے معرکوں کو نقصان ہی نہیں پہنچایا بلکہ بلند شہر میں بھی نواب رامپور نے جبکہ وہاں مجاہدین انگریزوں پر غلبہ پا رہے تھے، غداری کی۔ اس وقت نواب رامپور کے سفیر شیخ وجیہ الزماں خاں نے نواب رامپور کو لکھا کہ کمشنر صاحب بریلی میں دو سو سوار طلب کرتے ہیں۔ چنانچہ دو سو سوار بریلی کے لئے روانہ کئے گئے۔ یہ میر گنج جو رامپور سے بیس میل کے فاصلے پر تھا پہنچے ہی تھے کہ وجیہ الزماں کو نواب رام پور کی دوسری چھٹی ملی کہ جو دو سو سوار بریلی کے لئے طلب کئے گئے تھے ان کی بریلی میں ضرورت نہیں ہے بلکہ ان کو بلند شہر بھیجدیا جائے۔ چنانچہ نواب رام پور کے حکم کے مطابق ۲۴ مئی ۱۸۵۷ء کو یہ سوار بلند شہر پہنچے۔ بلند شہر کے لوگوں نے انگریزوں کے

مکانات لوٹ کر جلائے اور قتل کرنا شروع کیا۔ رامپور کے یہ دو سو سوار بالکل ناکارہ ثابت ہوئے۔ مجاہدین نے اس قدر زور پکڑا کہ بلند شہر سے تمام انگریزی افسر چلے گئے۔ ان سواروں کو بھی رام پور واپس جانا پڑا۔

روہیل کھنڈ کے عوام نواب یوسف علی خاں کو ملک کا غدار اور انگریزوں کا بہی خواہ سمجھتے تھے اور خاص طور پر رام پور کے لوگ بہادر شاہ ظفر کو ان کے ملک دشمن واقعات سے مطلع کرتے رہتے تھے جس سے بہادر شاہ ظفر متاثر ہوئے اور ان پر چڑھائی کرنے کے لئے بھی سوچنے لگے تھے لیکن حالات نے ان کو ایسا کرنے کی اجازت نہیں دی۔ چنانچہ محمد شفیع جو انگریزی فوج میں رسالدار تھے روہیل کھنڈ میں بغاوت کر کے جب دہلی پہنچے تو انہوں نے بہادر شاہ ظفر کے دربار میں خاص رسائی حاصل کی تھی اور اس مضمون کا ایک خط نواب یوسف علی خاں کو دہلی سے لکھا تھا۔[1]

"چند رام پور والوں نے ظل سبحانی سے عرض کیا ہے کہ نواب صاحب کفاران بے دین مقیم نینی تال کو رسد بھیجتے ہیں اور ان کی دل جمعی کرتے ہیں اس وجہ سے ظل سبحانی تم سے بہت ناخوش ہیں۔ اور جب میں نے عرض کیا کہ نواب سے یہ امر ممکن نہیں تو ارشاد ہوا کہ باوجود قلیل و فوج کثیر کیوں انہوں نے کافروں کے سر اب تک ہمارے پاس نہیں بھیجے اور یہ جب تک نہ ہوگا ہم ناخوش رہیں گے۔ اس طرح اور بھی خبریں رات ظل سبحانی

[1] اخبار الصنادید ص۲۰۷۔

کے گوش گذار ہوئی ہیں۔ ایک شخص نے یہاں آکر کہا کہ نواب صاحب نے ایک ہزار اشرفیاں تین شخصوں کی معرفت دلسن صاحب کو میرٹھ بھیجی ہیں چند شخصوں نے لاٹ گورنر جنرل ملکی و جنگی ہمت خاں سے بیان کیا کہ نواب صاحب نے مرادآباد کا علاقہ مجدالدین احمد خاں سے بزور لے لیا ہے اور شاہی سند کا کچھ لحاظ نہیں کیا اور یہ بھی کہا کہ ایک بار جو رسد بھیجی گئی تھی وہ خان بہادر خاں کے ملازموں نے لوٹ لی۔ ان وجوہ سے مزاج شاہی میں نہایت تکدر ہے اور ہمیشہ آپ کی جانب فوج روانہ کرنے کی تجویز ہوتی ہے۔"

نواب رامپور نے ان حالات کو سامنے رکھ کر اپنا بچاؤ کرنے اور بہادر شاہ ظفر کو مطمئن کرنے کے لئے یہ چال کھیلی کہ اور حکومتیں اور نواب بہادر شاہ ظفر کو نذریں پیش کر رہی ہیں اور وفاداری و حمایت کی سندیں بھی حاصل کر رہی ہیں، مجھے بھی بہادر شاہ کو نذر بھیجنی چاہئے تاکہ وہ مجھ سے بھی مطمئن ہو جائیں۔ چنانچہ اس کام کے لئے نواب رامپور نے منشی نہال الدین کو مقرر کیا ان کو شاہ دہلی کے واسطے ایک تحریر دی اور ایک سو اشرفیاں نذر کے طور پر دیکر روانہ کیا۔ ۳ اگست کو منشی صاحب دہلی پہنچے اور اپنی آمد کی اطلاع بہادر شاہ کو کرائی بعد دوپہر بہادر شاہ ظفر نے دیوان عام کیا۔ منشی نہال الدین کو دربار میں بلایا انھوں نے بہادر شاہ کو چٹھی کے ساتھ نذر پیش کی۔ بادشاہ نے بڑی خوشی کے ساتھ نذر قبول کی۔ منشی نہال الدین اس عرصہ مخبری کرتے رہے بخت خاں

کو جب اس کا علم ہوا تو انہوں نے ان کا تمام سامان لوٹ کر گرفتار کر کے بہادر شاہ کے سامنے پیش کیا کہ یہ شخص نینی تال کے انگریزوں کی طرف سے یہاں مخبری کے لئے آیا ہے۔ اسی وقت حکم ہوا کہ توپ سے باندھ کر اس کو اڑا دیا جائے۔ بڑی خشکل کے بعد ان کی جان بچی اور رامپور پہنچے۔

رامپوری رعایا ننانویں فی صدی نواب یوسف علی خاں کی مخالف تھی۔ ان کی انگریز دوستی کو انتہائی بری نگاہ سے دیکھتی تھی۔ ان کا فوجی سپاہی بننا بھی ان کو گوارا نہیں تھا۔ رام پور کے لوگوں نے نواب یوسف علی خاں کو کرسٹان کا خطاب دیا تھا جس کی تصدیق اخبار الصنادید مؤلفہ مولوی نجم الغنی صاحب رامپوری فرماتے ہیں۔

"کچھ سپاہی خاص نواب صاحب کی حفاظت کرتے ہیں اور وہ پلنگ کا پہرہ مشہور ہے۔ شب کو جو سپاہی پہرہ بدلوا تا تھا تو تمام سامان سپرد کرنے کے بعد کہتا تھا کہ "ایک کرسٹان بھی ہے"۔ نواب صاحب بحالت بیداری اس قسم کے بلکہ اس سے زیادہ سخت کلمات سنا کرتے تھے۔ گلی کوچوں میں نواب صاحب اور معتمدین کی نسبت علانیہ سخت وسست الفاظ اور کرسٹان کا لفظ استعمال ہوتا تھا۔"

جب نواب یوسف علی خاں کی انگریزوں کی امداد و اعانت، سر توڑ کوششوں اور ناپاک ہتھکنڈوں سے روہیل کھنڈ کی جنگ آزادی ۱۸۵۷ء ناکام ہوئی انگریزوں کو فتح ہوئی اور بریلی پر بھی انگریزوں کا قبضہ ہو گیا۔ عین اس وقت جب کہ

مجاہدین بندوقوں کی گولیوں اور توپ کے گولوں کا نشانہ بنائے جارہے تھے اور پھانسیوں پر بھی چڑھ رہے تھے ان ہی ایام میں خاص رام پور میں انگریزی افسران کی دعوت ہوئی۔ اس محفل میں نواب صاحب کو وہ پیالہ دیا گیا جس پر ان کا نام کندہ تھا۔

یہ وقتی جشن تھا ایک عام جشن ۱۵ مئی ۱۸۵۹ء مطابق ۲۳ ربیع الثانی ۱۲۷۶ھ کو فتح گڈھ میں لارڈ کیننگ گورنر جنرل نے منعقد کیا اس میں نواب یوسف علی خاں کا شکریہ ادا کیا اور گورنر جنرل نے ان سے مخاطب ہو کر کہا۔

"مجھ کو بڑی خوشی اس بات کی ہے کہ ان خدمات کے عوض جو آپ نے ملکہ معظمہ کی کیں، آج آپ کا شکریہ ادا کرنے کا موقع ملا۔ آپ اپنی ذات خاص سے زمانہ غدر میں نہایت مستعد اور صادق رہے اور آپ نے باوجود خوفِ جان ریاست کے گرد و نواح میں نہایت مشقت اور مستعدی سے حکومت برقرار رکھی اور ملکہ معظمہ کے افسروں کی مدد بقدر امکان بخوبی کی۔ سب سے بڑھ کر آپ نے ایک مجمع کثیر ہم قوم ملکہ معظمہ کی جانیں بچائیں ان کو سب آفتوں سے محفوظ رکھا اور ان کو ہر طرح کی آسائش دی حالانکہ وہ زمانہ چاروں طرف خوف سے گھرا ہوا تھا۔ میں بڑی خوشی سے روبرو سپہ سالار افواج ہند ملکہ معظمہ اور بہت سے معزز افسر اور حاکمان ملکی کے جو دیگر مقامات ہندوستان میں عہدہائے جلیلہ پر منصوب ہیں آپ کے حسنِ خدمات کا اقرار کرتا ہوں۔ مجھ کو یقین ہے کہ آپ کی کارگذاریوں کو یہ لوگ

ہر گز نہیں بھولیں گے۔"

نواب یوسف علی خان نے اپنے ملک و قوم کو تباہ و برباد کرنے کے لئے جو کھلم کھلا انگریزی قوم کے ساتھ سلوک کیا اس کا صلہ انگریزوں کو فوراً آنکھ بند کر کے ان کو دینا چاہئے تھا لیکن انگریزوں نے ایسا نہیں کیا بلکہ جب تک تصدیق و تحقیقات نہیں کر لی ان کو مستحق انعامات نہیں سمجھا۔ ایک انگریزی افسر مسٹر الیگزینڈر کی رپورٹ یہ ہے۔

"نواب کی روش و طریقہ بڑا صاف رہا ہے انہوں نے ابتدا شورش سے انتہا تک انگریزوں کی اطاعت میں کوئی فرق نہیں آنے دیا حالاں کہ وہ مسلمانوں کے جوشیلے اور ایسے عمائد و اکابر لوگوں کے ساتھ تھے اور اس قسم کی فوج کے مابین تھے جو نواب صاحب کو مشکوک نگاہوں سے دیکھتی تھی اور ان سے مطمئن نہیں تھی اور بغاوت کے لئے تیار رہتی تھی۔ نواب کو ایسے لوگوں نے گھیر رکھا تھا جو ان کو بھی بغاوت کی ترغیب دیتے تھے اور گستاخی سے پیش آتے تھے۔ اور لا مذہب کہہ کر ان کو دھمکاتے اور چڑاتے تھے لیکن وہ گورنمنٹ کی دوستی پر مضبوطی کے ساتھ قائم رہے ہر ممکن طریقے سے گورنمنٹ کی مدد کی۔ نواب صاحب کے ذریعہ علاقہ مراد آباد کا جو لگان وصول ہوا وہ جائز و مناسب موقعوں پر انگریزی حکومت کے فائدہ کے لئے خرچ ہوا۔ بریلی اور روہیل کھنڈ کے دوسرے اضلاع کے حاصل کرنے میں انہوں نے اس وقت ساتھ دیا جب کہ ہمارے پاس کوئی آدمی بھی نہیں تھا وہ زمانہ ایسا تھا کہ گوروں کی فوج جنگ سے گھراتی تھی ان پر بڑا خوف طاری تھا۔ نواب صاحب کی انگریزی حکومت اس وجہ سے

زیادہ مشکور ہے کہ انہوں نے روپیہ دیکر اور سامانِ رسد پہنچا کر انگریزوں کی جانیں بچائیں اور جو بڑی تعداد میں انگریز مرد و عورت اور بچے نینی تال میں پناہ گزیں تھے ان کو محفوظ مقامات پر خود پہنچایا۔ ان کی یہ بے زوال اور بے نظیر ہمدردی و وفاداری یادگار کے طور پر ہمیشہ قائم رہے گی۔"

۲۳ جون ۱۸۶۰ء کو انگریزی حکومت کی حمایت و اعانت و خیر خواہی و وفاداری کرنے کے سلسلے میں لارڈ کیننگ گورنر جنرل ہند نے ۱۱۶ مواضعات جن کی قیمت ایک لاکھ اٹھائیس ہزار پانچسو روپے چار آنے ہے، نواب یوسف علی خاں کو دیئے اور سند جاگیرداری بھی عنایت کی جس کی عبارت یہ ہے۔

چونکہ فرزند دل پذیر نواب سید یوسف علی خاں نواب رام پور نے شروع مفسدی سے آخیر تک بہم رسانی امداد نقد و جسمانی و پناہ دہی و حفاظت جان عیسائیان و انجام دہی و دیگر حسنِ خدمات سے خیر خواہی لاجواب حسبِ اطمینان سرکار انگریزی ثابت کی سابق نواب کا شکریہ اور خلعت امتیاز عطا کیا گیا ہے۔ علاوہ اس کے بسلسلۂ خدمات سرکار دیہات علاقہ بریلی و مراد آباد کے بموجب فہرست علیحدہ جن کی جمع ایک لاکھ اٹھائیس ہزار پانچسو ستائیس روپے چار آنے ہے برائے دوام نسلاً بعد نسلاً ان کو عطا فرما کر دیہات مذکورہ نواب کے قدیم ملک میں شامل کئے گئے اور ان ہی کی شرائط پر جیسے اس پر قابض ہیں ان پر بھی متصرف رہیں گے۔"

اس جاگیر کے ملنے پر نواب یوسف علی خاں نے ایک تاریخی قطعہ کہا تھا :-

جب گورنمنٹ سے ہوا حاصل ملک مجھ کو بصیغۂ انعام
ناظم ازروئے ہمتِ عالی سال بخشش ہے بخشش حکام

اس جشن و تہنیت کے موقعہ پر مرزا غالب مرحوم و مغفور نے بھی ایک نظم فرمائی تھی جس کے چند شعر یہ ہیں :-

پاشند آب گر بہ بہت بہر رفع گرد ہر قطرہ زان نمونۂ درّ یتیم باد
ہر صیغہ کہ وضع وے از بہر امر تست فارغ ز ننگ زحمت تقدیم میم باد
چوں غنچہ کہ پہلوئے گل بشگفد بباغ ملک جدید شاملِ ملک قدیم باد

۲۰ جولائی ۱۸۶۱ء کو الہ آباد میں لارڈ کیننگ گورنر جنرل نے ایک دربار کیا اور اس میں مہاراجہ سندھیا، مہاراجہ پٹیالہ اور بیگم بھوپال کے ساتھ نواب رام پور کو بھی تمغہ اسٹار آف انڈیا دیا۔ جب نواب علی خاں دربار سے فارغ ہو کر رام پور آئے تو میر محمد بلگرامی نے یہ قطعہ تاریخ موزوں کیا :-

زہے خطاب نکو نامی خوشا تمغہ کہ بانشانِ سعادت بود ستارۂ ہند
چنیں عطیۂ عظمیٰ سزد بہ ممدوحم کنوں گرفت فروغِ ابد ستارۂ ہند
دبیر چرخ بتاریخ چوں قلم برداشت نوشت آب بجو رشید زد ستارۂ ہند

۱۸۶۱ء

نواب یوسف علی خاں ۱۲۸۱ھ کو سرطان کے مرض میں علیل ہوئے۔ نوروز کے دن شوال کے مہینہ میں ان کو تندرستی ہوئی اور غسلِ صحت کیا جس

کی تاریخ نواب کاظم علی خاں عرف چھوٹے صاحب نے کہی ہے

غسل از ظہر جناب نواب سرطان دور و بے فزائے شفا

مرزا غالب نے یہ تاریخ فرمائی۔ ہے

دائم شنیدہ کہ ورا قصائے مغربست سرچشمہ کہ خضر شد از وے بقا پذیر

جوئے بریدہ اندر سان کردہ اند آب حمام را بحوض ازاں فرخ آب گیر

ہنگام شب کہ زیر زمیں باشد آفتاب ازتاب مہر گرم شد آں آب ناگزیر

حمام حوض بنگر و گل جامش آسمان واں را سفید کردہ فروغ مہ منیر

آمد برائے غسل بہ گرمابہ اندروں مانند معنی کہ بتہد رہمے در ضمیر

انیک فراغ اختر نیک و خجستہ روز پیداست زیں سہ لفظ سنہ تاریخ دلپذیر

اسی خوشی میں باغ بے نظیر میں بڑا بھاری جشن کیا گیا۔ جناب امیر احمد مینائی نے اس تقریب میں یہ تاریخ فرمائی۔ ہے

شرف واں مہر کو ہے یاں عروج ماہ دولت ہے

عجب صحت، عجب جلسہ، عجب شادی کی ساعت ہے

کہے سالِ ہمایوں ہاتف بہ امیر ایسا

مہینہ عید کا نوروز کا دن غسلِ صحت ہے

مرض پوری طرح ختم نہیں ہوا تھا اس لئے پھر بیمار ہو گئے اور مرض بڑھ گیا۔ ۲۴ ذی قعدہ ۱۲۸۱ھ مطابق ۲۱ اپریل ۱۸۶۵ء کو جمعہ کے دن انتقال ہوا۔ ۵ مارچ ۱۸۱۶ء کو پیدا ہوئے تھے۔ اس حساب سے پچاس برس کی عمر پائی۔ امام باڑے کے بیرونی دالان میں دفن ہوئے۔ امیر مینائی نے یہ

تاریخ وفات کہی۔ ؎

در فراقِ ناظمِ معجز بیاں یوسف لقا | جوش زد سیلابِ خوں از دیدۂ گریانِ من
تاب از دل رفت و دل از دست و دست از کار رفت | رفتنِ او جملہ برہم زد سر و سامانِ من
تیرہ شد چوں شامِ ماتم در نظر ایں خاکداں | چاک شد مانند دامانِ سحر دامانِ من
شکرِ منت ہائے او ایمانِ خود دانستہ ام | ذکرِ او تا بودہ ام بودست حرزِ جانِ من
بسکہ از شور و فغانم محشرے برپا شدہ است | می شود شورِ قیامت، ہر نفس قربانِ من
گریہ ام در ماتمش رنگِ فراوانی گرفت | می چکد طوفانِ نوح از گوشۂ دامانِ من

بہرِ سالِ آں عزیزِ مصرِ دلہا گفت امیرؔ
مسند آرائے جناں شد یوسفِ دورانِ من

۱۲۸۱ھ

جناب نواب محمد یوسف صاحب کو شعر و شاعری کا شوق تھا ناظمؔ تخلص تھا۔ نکتہ شناس تھے پہلے حکیم مومن خاں مومنؔ دہلوی کے سامنے زانوئے ادب طے کیا۔ پھر مرزا غالبؔ کو کلام دکھایا۔ اس کے بعد منشی مظفر علی خاں اسیرؔ لکھنوی اور سب سے آخر میں جناب امیرؔ مینائی سے مشورہ سخن کرنے لگے تھے۔ پہلی بار دیوان ۱۲۷۵ھ میں چھپا جس کو بہ نظر اصلاح مرزا غالبؔ نے دیکھا۔

ناظمؔ کے کلام میں بلند خیالی پائی جاتی ہے۔ زبان میں لطافت کے ساتھ فصاحت ہے۔ لطیف اشعاروں اور رنگین تشبیہوں سے کلام میں جان پڑ جاتی ہے۔ مرزا غالب کے تلمذ پر ان کو ناز تھا۔ فرماتے ہیں۔ ؎

ناظم ہمیں تتبع غالب پہ ناز ہے ہوگا کسی کو پیرویٔ میر پر گھمنڈ

بے پردہ آکے کل مجھے صورت دکھا گیا اک پردہ تھا نہ آنے کا وہ بھی اٹھا گیا

کافر ہوں گر رہی ہو توقع جواب کی قاصد سے یہ سنوں کہ مرا خط پڑھا گیا

اپنے دل و جگر کو پڑا پیٹنا مجھے تیری گرہ سے دیدۂ خونبار کیا گیا

کیوں میری ضد سے سوگ میں بیٹھو رقیب کے کیا جانتے نہیں ہو کہ جو مر گیا گیا

تم خوش ہوئے ہو بزم میں آنے سے غیر کے
یہ بھی نہیں خبر ہے کہ ناظم چلا گیا

واعظ بُرے ہیں رند چلے جاؤ تم شتاب اچھا نہیں ہے عزت و توقیر پر گھمنڈ

وہ حور ہے پری نہیں آجائے سامنے ہو جس کو سحر و دعوتِ تسخیر پر گھمنڈ

نظارگی ہوں صورت بزم شہود کا!
تقدیر کا گلہ ہے نہ تدبیر پر گھمنڈ

میں نے کہا کہ دعوئے الفت مگر غلط کہنے لگے کہ ہاں غلط اور کس قدر غلط

تاثیر آہ و زاری شبہائے تار جھوٹ آوازۂ قبول دعائے سحر غلط

آجائے کوئی دم میں تو کیا کچھ نہ کیجئے عشق مجاز و چشم حقیقت نگر غلط

بوس و کنار کے لئے یہ سب فریب ہیں اظہار پاکبازی و ذوقِ نظر غلط

پوچھو تو کوئی مر کے بھی کرتا ہے کچھ کلام کہتے ہو جان دی ہے سرِ رہگذر غلط

ہم پوچھتے پھریں کہ جنازہ کدھر گیا مرنے کی اپنے روز اڑائی خبر غلط

یہ کچھ سنا جواب میں ناظم ستم کیا
کیوں یہ کہا کہ دعوئے الفت مگر غلط

جس وقت چمکتی ہے تو چھپ جاتے ہو ڈر کر
کیا برق پر تم کو مرے نالے کا گماں ہے

زاہد ہے اگر معتکفِ حجرۂ مسجد
آرام گہ اپنا بھی درِ پیرِ مغاں ہے

روکوں گا تو کیا دل پہ غضب ڈھائے گا ناظم
یہ اشک جو یوں آنکھ سے دن رات رواں ہے

وفا کی ہم نے اور تم نے جفا کی
تم اچھے، ہم برے قدرت خدا کی

ہم تم کو برا کہتے ہیں یا خو کو تمہاری
تو خو کے بھی اچھے ہی سہی جھگڑا نہ کرو تم

ہو رات تو جیتے رہیں امید سحر پر
یہ روزِ سیہ ہے شبِ دیجور نہیں ہے

نہ گذر دوست تک اپنا، نہ بغیر اسکے قرار
کس پہ آئی ہے اور آئی ہے طبیعت کیسی

کہتے ہو کہ ہم غیر کو آنے نہیں دیتے
سچ ہو بھی پر میں نے سنا اور ہی کچھ ہے

اب لکھیں گے شکوۂ بیداد ہم دل کھول کر
نام ان کا آسماں ٹھہرا لیا تحریر میں

ہونے دیا نہ شادیِ دن پھر کہاں مجھے
ہے ہے تمہیں رقیب کے مرنے کا غم ہوا

کہتے ہو کہ وہ بھی یہی کہتے ہیں کروں کیا
کہتے ہو کہ دل جوئی اعدا نہ کرو تم

یہ خوشی کیا ہے کہ ہے ذکر ہمارا ہوتا
ہوتے ہم اور ہمیں بات کا یارا ہوتا

آدمی کے ساتھ سو آزار ہیں یہ کیا کہ بس
آہ کی اور راز الفت آشکارا ہو گیا

کیا تم نہ جانتے تھے کہ بے خانماں ہوں میں
پھرتا ہے نامہ بر مرا گھر پوچھتا ہوا

جب کہا ان سے کہ ہے کچھ مجھے کہنا تو کہا
سن لیا ہم نے کوئی شکوۂ بے جا ہوگا

تو نہ آیا پہ اجل وقت سے پہلے آتی
آدمی اس کی مگر اتنی تمنا کرتا

کیوں آ کے کہو در پہ کہ وہ گھر میں نہیں ہیں

کیا ہم نہیں پہچانتے، سرکار کی آواز

ہے یہ ساقی کی کرامت، کہ نہیں جام کے پاؤں

اور پھر بزم میں سب نے اسے چلتے دیکھا

فسانۂ ستمِ ہجر ہے، سوال نہیں
نہ دو جواب سنے جاؤ، کچھ ملال نہیں

نالے کے مجھے طور بہت یاد ہیں لیکن
طاقت کا گماں بھی ہو دلِ غمزدہ پہ کچھ

جو کہئے دردِ دل سنتے تو کہتے ہیں کہ ہاں کہئے

اسی کو دردِ دل کہتے ہیں، جو گفتار میں آئے

وفا شعاری ناظم یقیں نہیں، نہ سہی
یہ کون شخص ہے اس کا بھی کچھ خیال نہیں

جانتے ہم بھی کہ ہے خلد میں راحت کیسی
ملتی اس میں سے اگر ہم کو یہاں تھوڑی سہی

اس سے کیا بحث کہ ہوگی شبِ فرقت کیسی
موت اس میں نہیں آتی یہ مصیبت کیسی

حشر میں کھینچوں ترا دامن بھلا دیکھوں کہ تو
واں بھی جھنجلا کے کہے یوسف علیحاں چھوڑ دے

فقیر بن گیا واں، تو کیا سوال کروں
مگر کہوں گا "بھلا کر ترا بھلا ہوگا"

معتقد ہو کعبہ کا ناظم مگر جا کر وہاں
عبرت آتی ہے کہ کیا بتخانہ ویراں ہو گیا

رہی تم ہو وہی خنجر ہے پر انصاف کرو
ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہو کیا میرے بعد

میری وفا کی داد نہ جرمِ عدو کی بحث
کیا خوبیاں ہیں میرے تغافل شعار میں

نہ تھی تم سے توقع یوں عدو کے دم میں آنے کی
کہاں جاتی رہی وہ خو محبت آزمانے کی

کہے یہ کون کہ تم کیوں وفا نہیں کرتے
وہ کیا کہیں گے مگر یہ کہ جا نہیں کرتے

سبھی اس عمر میں ہو جاتے ہیں ایسے ہی حواس
تجھ سے کچھ شکوہ اے فلک پیر نہیں

ستم میں شہرہ جو وہ آفت زمانہ ہوا — فلک کو عذر ستم کے لئے بہانہ ہوا

واعظ و شیخ سبھی خوب ہیں کیا بتلاؤں — میں نے میخانہ سے کس کس کو نکلتے دیکھا

ہوتے ہی دردِ دل کا بیاں اٹھ کھڑے ہوئے — یعنی یہ ایسے ہیں کہ نہ ان سے سنا گیا

یہ غصہ ہے کہ دلِ مضطرب نشانہ تھا — ہوا جو تیر خطا، میں گنہ گار ہوا!

شریک دولت ناز و نیاز رکھتے ہو — انیس خلوت شبِ ہائے تار سمجھے ہو

ہوئے ہو ایک بت دل فریب پر عاشق — زہے کہ آپ کو ناکردہ کار سمجھے ہو

صلاح و مشورہ رکھتے ہو مجھ سے اور مجھے — فنون عشق کا آموزگار سمجھے ہو

اگرچہ خوش ہوں پہ آتا ہے رحم بھی تم پر — کہ مجھ سے غمزدہ کو غمگسار سمجھے ہو

انداز نیا ہے دل لگی کا — ہنسنے میں پتہ نہیں ہنسی کا

ترے گھر وہ آئے ناظم، تو یہ اضطراب کیا ہے
کوئی بادشاہ آیا، کوئی شہریار آیا

••

نوّاب

نوّاب کلب علی خاں رامپوری

نواب کلب علی خاں ۲ر ذی الحجہ ۱۲۵۰ھ مطابق ۱۹ر اپریل ۱۸۳۵ء یکشنبہ کو صبح کے وقت پیدا ہوئے۔ نواب صاحب نے فارسی کی کتابیں خلیفہ محمد غیاث الدین عزت مؤلف غیاث اللغات سے پڑھی تھیں اور مولوی فضل حق خیرآبادی سے چند علوم عقلیہ تحصیل کئے تھے اور شمس العلماء مولوی عبدالحق خیرآبادی سے علوم عقلیہ کی بقایا کتابیں پڑھیں اور میر عوض علی سے خوش نویسی سیکھی۔

نواب کلب علی خاں اپنے والد کے ہمراہ بریلی، مرادآباد، رامپور اور نینی تال وغیرہ میں جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں شامل ہوئے تھے۔ انہوں نے مرادآباد کی ابتدائی جنگ آزادی کو فیل کرنے کے لئے اس کے بانی مولوی منّو کی شہادت کے بعد ان کے ساتھیوں کو جیل خانہ میں بند کیا اور اذیتیں دیکر مارا نینی تال میں اس وقت جنگ آزادی خاتمہ پر تھی اور انگریزی افسران نینی تال میں

پناہ گزیں تھے ان کو نواب کلب علی خاں نے اپنی فوج کی نگرانی میں کالاڈھونگی سے بحفاظت ہاتھیوں پر سوار کر کے مراد آباد پہنچایا۔ جس پر انگریزی افسروں نے نواب یوسف علی خاں سے خوش ہو کر کہا کہ ہم ٹوپی سے موزہ تک آپ کے بندۂ بے دام ہیں ہماری جانیں آپ کی سبب سے قائم رہی ہیں۔

نواب یوسف علی خاں نے اپنے انتقال سے قبل نواب کلب علی خاں کی ولی عہدی ۱۸۶۴ء میں اینڈ منڈ ڈریمنڈ صاحب لفٹنٹ گورنر ممالک متحدہ کے ذریعہ لارڈ لارنس گورنر جنرل ہند سے منظور کرائی تھی۔ نواب یوسف علی خاں کے انتقال کے بعد نواب کلب علی خاں تجہیز و تکفین سے فارغ ہوتے کے بعد مسند نشین ہوئے اعدا ہ کانِ ریاست سے نذریں لیں۔ اس کے بعد ۱۵ محرم ۱۲۸۲ھ مطابق ۱۸۶۵ء کو مسٹر جان انگلش ایجنٹ ریاست اور کمشنر روہیل کھنڈ رام پور آئے اور اسی روز خاص دیوان خانہ میں گورنمنٹ کی طرف سے مسند نشین کئے گئے۔ منشی امیر مینائیؔ نے مسند نشینی پر یہ تاریخ کہی۔ ؎

آفتاب سپہر حشمت نے	تخت پر جب جلوس فرمایا
فرطِ بالیدگی سے وقت جلوس	پایۂ عرش تخت نے پایا
عرشیوں نے کہا مبارک ہو	فرشیوں کے سروں پہ یہ سایا
سایہ اس سایۂ الٰہی کا	ابر رحمت کی طرح سے چھایا
تخت دولت پہ ماہِ دولت نے	مہر ہو کر جلوس فرمایا
مہر کا رنگ ہو گیا پھیکا	ماہِ کامل فلک پہ شرمایا
نذر کو آسمانِ دُرِ انجم	طبق ماہتاب میں لایا

نور سے طور ہو گئی کوٹھی | پرتو حسن نے یہ چمکایا
کیوں نہ خوش ہو محمدی مشرب | عہدِ خلق محمدی آیا
اس سلیمان نے خلق سے اپنے | خاتمِ دل پہ نقش بٹھلایا
جی اٹھا جس سے چار باتیں کیں | رنگ اعجاز تازہ دکھلایا
چھک گئے میکشانِ بزمِ سوال | جامِ جود و کرم جو چھلکایا
نئے سر سے جواں ہوا اقبال | نخلِ دولت مراد پر آیا
ہے یہ سر تاجداروں کا | اس پہ اللہ کا رہے سایا

واقعی ہے امیر سالِ جلوس
دور دورِ فلاح اب آیا

۱۲۸۱ھ

۱۷ محرم کو نواب کلب علی خاں نے تمام ملازمین کو خلعت عنایت کیے۔ ۲۵ محرم کو حکیم سعادت علی خاں فوج کے جنرل فوت ہوئے ان کی جگہ صاحبزادہ سید علی اصغر جنرل مقرر ہوئے۔ پھر مکہ معظمہ سے رجب کے مہینہ میں مسند نشینی کا خلعت آیا۔ گیارھویں رجب سے انگریزی حکام آنے شروع ہوئے۔ ۱۴ رجب ۱۲۸۲ھ مطابق ۱۴ دسمبر ۱۸۶۵ء کو مسٹر جان انگلسن کمشنر روہیل کھنڈ اور ریاست رام پور کے ایجنٹ مع اور انگریزی افسران آغا پور آئے۔ ۱۵ رجب کو نواب صاحب مسٹر جان انگلسن ایجنٹ سے ملاقات کرنے گئے۔ انہوں نے نواب صاحب کو خلعت مسند نشینی جس میں ۲۲ پارچے تھے پہنایا۔ ہاتھی اور گھوڑا بھی دیا۔ مسٹر جان انگلسن ایجنٹ ریاست نے نواب کلب علی خاں کی وفاداری

بلند اقبالی کو دیکھ کر لفٹننٹ گورنر کے پاس رپورٹ بھیجی جس پر لارڈ لارنس گورنر جنرل ہند نے نواب صاحب کو لیجس لیٹو کونسل کا ممبر مقرر کیا اور اسی کونسل میں شرکت کے لئے آپ ۲۰ شعبان ۱۲۸۳ھ مطابق ۲۸ دسمبر ۱۸۶۶ء کو رامپور سے علی گڑھ تک اور علی گڑھ سے کلکتہ پانچسو آدمیوں کے ہمراہ گئے اور کونسل میں شریک ہوئے۔ کانپور، الہ آباد اور بنارس کے درمیان ان کا شاندار استقبال ہوا اور ان کو سلامی بھی دی گئی۔

نواب کلب علی خاں انصاف پسند طبیعت رکھتے تھے اور ان لوگوں کو پسند کرتے تھے جو انصاف کرنے میں کسی کی رو رعایت نہ کرتے ہوں خواہ کسی بڑی سے بڑی طاقت کا اثر اور سفارش ہی کیوں نہ حائل ہو جائے۔ چنانچہ حسب ذیل واقعہ ان کی انصاف پسندی کا ثبوت ہے۔

نواب کلب علی خاں کے مسند نشین ہونے سے قبل منشی امیر مینائی صاحب عدالت دیوانی کے مفتی تھے۔ اس زمانہ میں نواب کلب علی خاں ولی عہد تھے۔ انہوں نے اپنے باورچی کے مقدمہ میں اس کے حق میں فیصلہ کرنے کی کی سفارش امیر مینائی کے چوبدار کے ذریعہ کرائی۔ منشی صاحب نے ان کی سفارش نہیں مانی اور باورچی کے مخالف کے حق میں فیصلہ دیدیا۔ ولی عہد بہادر کو یہ بات بہت ناگوار گذری جس کا علم امیر مینائی صاحب کو بھی ہو گیا تھا۔ جب نواب کلب علی خاں تخت پر بیٹھے تو امیر مینائی صاحب نے احتیاط کے طور پر رام پور سے جانے کا ارادہ کیا۔ اس بات کی خبر نواب کلب علی خاں کو بھی ہو گئی انھوں نے منشی صاحب کو طلب کیا اور دریافت کیا کہ کیا آپ کا یہاں سے جانے کا

ارادہ ہے۔ انہوں نے کہا ہاں۔ نواب صاحب نے جانے کی وجہ معلوم کی تو انہوں نے باورچی کے واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا میں نے اس مقدمہ میں آپ کی سفارش نہیں مانی تھی مجھ کو معلوم ہوا تھا کہ آپ اس پر مجھ سے ناراض ہو گئے تھے۔ نواب صاحب نے کہا واقعی مجھ کو اس وقت رنج ہوا تھا مگر اب میں آپ جیسے منصف و عادل آدمی کو پسند کرتا ہوں۔ اب آپ نہ جائیے بلکہ یہیں رہئے۔ چنانچہ امیر مینائی صاحب نے رامپور سے جانے کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔

نواب کلب علی خاں کے دورِ حکومت میں چوری تقریباً ختم ہو گئی تھی اور ڈاکہ کا بھی یہی حال تھا۔ یہ حقیقت تھی کہ اگر کوئی کمزور سے کمزور آدمی ہاتھوں میں رکھ کر سر بازار بڑی سے بڑی قیمتی چیز بھی لیکر جاتا تھا تو اس کو کوئی آنکھ بھر کر دیکھنے والا نہیں ملتا تھا۔ جہاں چوری ہوتی وہاں پولس والے فوراً پہنچتے تھے اور اس کا سراغ جلد سے جلد لگانے کی کوشش کرتے تھے۔ نواب صاحب کا طریقہ یہ تھا کہ جس علاقہ میں چوری ہوتی یا ڈاکہ پڑتا تو اس علاقہ کے پولس افسران کو کہہ دیتے تھے کہ فلاں تاریخ یا فلاں وقت تک اگر اس کا تم نے سراغ نہیں لگایا اور ملزم کو پکڑ کر نہیں لائے تو تمہاری تنخواہ بند کر دی جائے گی یا تم کو ملازمت سے علیحدہ کر دیا جائے گا۔ اس سختی کی وجہ سے پولس والے رامپور میں دیانتداری کے ساتھ مستعدہ کر اپنی ڈیوٹی بجالاتے تھے۔

آجکل کا ترقی پسند طبقہ شخصی حکومت کی مخالفت کرتا ہے اور نوابی و شاہی دور کو بری طرح کوستا ہے لیکن اگر آجکل کی نام نہاد عوامی اور جمہوری

حکومتوں کے حالات کا نوابی اور شخصی حکومتوں کے واقعات اور طریقوں سے مقابلہ کیا جائے اور جائزہ لیا جائے تو آج کل کی حکومتیں بمقابل نوابی دور کے عوام کی زیادہ دشمن پائی جائیں گی۔ اگر اس زمانہ میں کسی ملک میں قحط پڑ جاتا ہے اور لوگ بھوکوں مرنے لگتے ہیں تو جمہوریت کے علمبردار اس کو دور کرنے اور عوام کے پیٹ بھرنے کے بجائے ان کو اور جہنم میں دھکیلنے اور اپنے پیٹ بھرنے کی کوشش کرنے لگتے ہیں۔ لیکن نوابی و شخصی حکومت یعنی نواب کلب علی خاں نے قحط زدہ علاقوں کا کس طرح پیٹ بھرا اور کیوں کر اس مصیبت سے نجات دلائی وہ جمہوریت کا ڈھنڈورا پیٹنے والے بگوش ہوش سنیں۔

۱۸۷۲ء کو رام پور میں بارش نہ ہونے کی وجہ سے کھیتی باڑی کو بڑا نقصان ہوا غلہ کی پیداوار نہیں ہوئی۔ لوگ سخت مصیبت میں گرفتار ہوئے اور خصوصاً غریب و محنت کش و مزدور طبقے اور کاشت کاروں کو فاقوں کی نوبت آنے لگی۔ نواب کلب علی خاں نے فوراً لاچار اور اپاہج لوگوں میں غلہ تقسیم کرانا شروع کیا اور اس کا طریقہ یہ اختیار کیا کہ دیال داس خلف شیو پرشاد سے ہندوؤں کو چنے تقسیم کرائے اور مسلمانوں کو ریاست کے اہلکاروں کے ذریعہ غلہ بٹوایا۔ چنانچہ چار مہینے میں بیس ہزار پانچسو روپے کا غلہ تقسیم ہوا اور جو لوگ بدن میں جان رکھتے تھے اور طاقت ور دکھائی دیتے تھے ان سے عمارتیں بنوائیں اور نئی سڑکیں ڈالنے کا کام شروع کرایا۔ یہ سلسلہ بھی برابر چار مہینے جاری رہا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ریاست کا کوئی فرد بھوکا نہیں سویا۔

نواب کلب علی خاں نے غلہ وغیرہ کا محصول ایک لاکھ روپیہ سالانہ

کا ایک قلم موقوف کیا۔ صرف افیون، نمک اور شکر پر محصول قائم رکھا۔ محکمہ آبکاری جو آمدنی کا ایک اچھا ذریعہ تھا اس کو ختم کر دیا اور کسی قسم کی شراب بنا کر یا باہر سے لا کر تمام علاقوں میں فروخت کرنی بند کر دی اور بھٹیاں تڑوا دیں۔ ماہِ رمضان میں کسی شخص کی مجال نہیں تھی کہ شارعِ عام پر علانیہ کوئی چیز کھائے حتیٰ کہ اہلِ ہنود بھی اس پر عمل کرتے تھے اور رمضان کے مہینہ کی تکریم کرتے تھے۔

ریاست کے انتظامات اور اہلِ خاندان کی سازشیں نواب کلب علی خاں کے علمی ذوق پر کبھی غلبہ نہیں پا سکیں۔ ایسے نواب اس دور میں بہت ہی کم تھے جو فضل و کمال کے قدر دان ہوں اور ان کا ہر طریقے سے خیال رکھتے ہوں بقول صاحب اخبار الصنادید۔

"افسوس یہ ہے کہ ریاست کے انتساب نے ان کو نوابوں کے پہلو میں جگہ دی ورنہ شاعری، تاریخ فقہ، موسیقی، ادب کون سی بزم ایسی ہے جہاں فخر و شرف کے ساتھ ان کو جگہ نہیں دی جاتی۔ تحقیق مسائل کی جانب ہمیشہ توجہ رہتی تھی۔ مشکل و دشوار مسئلے ہر فن کے کامل سے حل کرتے۔ مباحثے سے زیادہ ذوق تھا۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سی تحقیقات علمیہ کا ذخیرہ ان کے ذہن میں جمع ہو گیا تھا۔ مشہور فارسی دیوانوں اور نثروں میں شاید ہی کوئی کتاب ہو گی جو ان کی نظر سے نہ گذری ہو۔ کوئی تاریخی سرگذشت، فقہی مسائل، علوم کے عمدہ مباحثے فلسفہ و حکمت کے نکتے ایسے نہ تھے جن میں وہ خود بحث و گفتگو کرنے کی لیاقت نہ رکھتے ہوں۔ ذہن خداداد، حافظہ بے مثل، شوق کا یہ عالم، اہلِ علم جمع، اب کس چیز کی کمی تھی۔"

نواب کلب علی خاں، ۲۷ جمادی الآخر ۱۳۰۴ھ مطابق ۲۲ مارچ ۱۸۸۷ء کو چہارشنبہ دن کے تین بجے بائیس برس سات مہینے حکومت کر کے ۵۶ سال کے قریب عمر پا کر فوت ہوئے۔ نواب صاحب نے اپنے غسل کے لئے بہت سا آبِ زمزم جمع کر رکھا تھا۔ آخری دم تک اسم ذات جاری تھا۔ نواب صاحب کو اول عام پانی سے غسل دیا گیا بعد میں بہت سا آب زمزم اوپر سے ڈالا گیا۔ دس ہزار سے زیادہ لوگ ان کی نماز میں شریک تھے۔ جنازہ جس وقت جا رہا تھا تو شہر میں ایک حشر برپا تھا ہر فرد بشر کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ حافظ جمال اللہ صاحب کے مزار کے نزدیک مغربی جانب زندگی میں قبر کھدوائی تھی اور خام چھ کے بنوا کر ان پر قرآن مجید ختم کرائے تھے، وہیں دفن ہوئے۔ محب علی خاں امروہوی نے حسب ذیل تاریخ وفات لکھی۔ ؎

وہ فخرِ ہند تھے تو یہ فخرِ زماں ہوئے — نواب اپنے وقت کے شاہِ جہاں ہوئے
افسوس حیف کلب علی خاں نوابِ ہند — دنیا سے سوئے عالمِ عقبیٰ رواں ہوئے
سونا ہوا ہے ہند، اداسی ہے ملک میں — جس وقت سے وہ عازمِ باغِ جناں ہوئے
عالم تھے، قدر دان تھے، مردم شناس تھے — وصاف ان کے خُلق کے پیر و جواں ہوئے

تاریخ نقل سال یہ کر دے محب رقم
جا کے وہ اس مکان سے خلد آشیاں ہوئے

منشی امیر مینائی نے ۲۱ شعر کی ایک ماتمی نظم لکھی تھی جس کے چند شعر درج کئے جاتے ہیں۔ ؎

الاماں از برق تازیہائے چرخ چنبریں — الحفیظ از فتنہ سازیہائے ایں آفت مکیں

جائے عبرت باشد ایں آشوب گاہ پرفتن | چشم بکشا و رمے نیرنگ دنیا را بہ بیں!
کافتاب آسمانِ شوکت جاہ و جلال | ماہ چرخِ دولت واقبال فیض اوو دیں
حق پرست و حق پذیر و حق شعار و حق شنو | حق شناس و حق پسند و حق گذار و حق گزیں
خوش مذاق و خوش بیان و خوشخصال و خوش جمال | خوشخط و خوش گوئے و خوش گفتار و خوش رو و حسیں
شیر دل کلب علی خان بہادر نامور | مالک طبل و علم رونق دہ تاج و نگیں
تا بہ کے افسانہ ایں درد نا لیہا امیر | تا کجا اظہار سوز دل بہ آہ آتشیں
وز پے سالِ وفات آں شہ خلد آشیاں | محو دیدار جمالِ رحمۃ اللعالمیں

نقش کن از خامۂ حسرت سر لوحِ مزار
خواب گاہِ حامئ اسلام امیر المومنیں

۱۳۰۴ھ

نواب کلب علی خاں کا دور پرسکون تھا اس لئے علماء میں سے مولوی عبدالحق خیر آبادی، مولوی سعد اللہ صاحب، مولوی مسیح الدین، مولوی سید بدرالدین صاحب، مولوی ریاض الدین صاحب، مولوی عبد العلی صاحب، مولوی ولی محمد جان بسمل وغیرہ شعرا میں منشی مظفر علی اسیر، منشی امیر مینائی، نواب مرزا خاں داغ دہلوی، جلال لکھنوی، منشی سید اسماعیل منیر شکوہ آبادی شیخ امداد علی بحر، خواجہ ارشد علی خاں قلق، منشی امیر اللہ تسلیم، مرزا رحیم الدین حیا اور سلال گنج بہاری لال جیرت وغیرہ اور خوشنویس ۔ ۔ ۔ وغیرہ اہل کمال ان کے دربار میں شریک ہوتے تھے اور دربار سے متعلق تھے۔

نواب کلب علی خاں اصناف سخن پر قادر تھے ان کی خوش بیانی اور

برجستہ گوئی کے عموماً لوگ معترف تھے۔ شعراء کے بیشمار اشعار ان کو یاد تھے۔ منشی امیر مینائی سے مشورہ سخن کرتے تھے۔ نثر نویسی پر بھی نواب صاحب نے توجہ دی تھی۔ بلبل نغمہ سنج، قصہ مہر و ماہ جاہ، ترانۂ غم، قندیل حرم اور شگوفۂ خسروی ان کی تالیفات ہیں۔ ایک تاریخ آپ نے لکھی ہے جس میں پرانے بادشاہوں کے خاندانوں کے حالات درج ہیں۔

نواب کلب علی خاں فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ فارسی کا ایک چھوٹا سا دیوان ہے جس کا نام "تاج فرحی" ہے اور اردو میں چار دیوان ہیں (۱) نشید خسروانی (۲) دستنبوئے خاقانی (۳) درۃ الانتخاب (۴) توقیع سخن۔ آپ کا تخلص نواب تھا۔ مولوی نجم الغنی رامپوری نے ان کے کلام پر انتہائی مناسب و موزوں تبصرہ کیا ہے۔ [۱]

"ان کی نظم اردو میں بڑے بڑے الفاظ، مضمون فارسی کی عمدہ ترکیبیں ان کی درست نشستیں جو جو ان کے لوازم ہیں سب موجود ہیں۔ عموماً کلام ان کا شاعری کے ظاہری عیبوں اور لفظی سقموں سے پاک ہے مگر تاثیر کم ہے اور بعض نازک خیالیاں تو ایسی ہیں کہ کوہ کندن و کاہ برآوردن، جیسے محاورے کے کوچے میں صاف صاف کہنا چاہتے ہیں جو ان کی جدت پسند طبیعت کے خلاف ہے تو لطف سخن مفقود ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی فارسی کے انشار پردازی کے شوق کو بھی بڑی کاوش اور عرق ریزی سے

[۱] اخبار الصنادید دوم صفحہ ۲۳۴۔

نبا ہتے ہیں۔ ان کے لفظوں میں شان وشکوہ اور معنوں میں وقت اور کلام میں دھوم دھام ہے مگر خیالات کی بلند پروازی اور مبالغے کے جوش وخروش نے یہاں بھی تاثیر کم کر دی ہے۔ ان کے کلام میں نمک ظرافت کا چٹخارہ بھی کم ہے۔ تاہم اور ناصح جو شعرا اردو فارسی کے لئے ہر جگہ رونقِ محفل میں یہ جب ان سے ہنس کر دل بہلاتے ہیں تو گرمی سخن بجھ جاتی ہے۔"

ان کے کلام میں نامانوس الفاظ بہت کم ملتے ہیں۔ ان کے کلام میں تصحیح کرنے کے لئے استاد کو بڑی دلیلیں لانا ہوتی تھیں۔ استاد کیا تھے فرمانبردار نوکر تھے۔ سہ

سینکڑوں مرے جلانے کو بنائے اغیار	نہ کیا چرخ نے تیرا کوئی ہمسر پیدا
شوق مستی میں ہوئی شورشِ محشر پیدا	جاؤں میخانہ اگر ہو کوئی رہبر پیدا
چرخِ بے مہر کی زینت سے خدا کو کیا کام	میرے گننے کو شبِ غم کے ہے اختر پیدا
خاک سے تیرے ظالم ہوئی پیدائشِ چرخ	ورنہ ہوتا نہ کبھی ایسا ستمگر پیدا

مطرب ہے، دورِ جام ہے تو اب تو بھی چل
گلشن میں آج جمع ہیں پھر بلبل و شراب

جس شوخ سے ہو سب کو عداوت کی توقع	کیوں کر ہو مجھے اس سے محبت کی توقع
افسوس وہ دیکھے غمِ ہجراں کی مصیبت	جس دل میں بھری ہو تری دولت کی توقع
وہ صدمے اٹھائے ہیں کہ اب روزِ جزا بھی	دل میں نہ رہی کوئی اذیت کی توقع
الفت میں کسی شوخ ستمگار کی مجھ کو	آفت کی ہے امید قیامت کی توقع

پھر جائیں گے رحمت حق ہی سے وگرنہ — طالع سے تو ہے اپنے مصیبت کی توقع

حیرت ہے مجھے، ہو گئی زاہد تجھے کیوں کر — واعظ کے فقط کہنے سے جنت کی توقع

مایوس ہوں میں اپنے گناہوں سے تو نواب
پر ذات سے خالق کے ہے رحمت کی توقع

منہ سے ہی دعا مانگ مری مرگ کی ظالم — پر دل سے خدا کے لئے دم بھر نہ ہٹا ہاتھ

تم دل سے تو کیا جان سے بھی جاؤ تو نواب — ہر گز نہ اٹھائیں وہ کبھی بہر دعا ہاتھ

جفا سے ہائے میں گھبرا گیا ہوں ہائے کیا ہو گا — یہی صورت رہی یارب جو عمرِ جاودانی کی

بسر کی اس طرح ہم نے شبِ فرقت کہ دنیا میں — حکایت رہ گئی تا حشر اپنی سخت جانی کی

غم ہجراں میں اب نواب تم کو خوب ہی سوجھی
نہ تم مرتے نہ وہ تعریف کرتے جانفشانی کی

••

واسطی

جناب سید فضل حسین

علوی خاندان سے جناب واسطی کا تعلق ہے۔ علم طب اور حساب میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ جوانی میں سفر اختیار کیا اور ریاست گوالیار پہنچے قسمت نے یاوری کی۔ جودھ پور کی ایجنسی کے سررشتہ دار مقرر ہوئے۔ اور ترقی کرتے کرتے راجستھان کی منشی گری پر مامور ہوئے کافی دولت کمائی۔ واجد علی شاہ کی سلطنت کے آخری زمانہ میں راجستھان سے ترک تعلق کر کے لکھنؤ وارد ہوئے۔ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں لکھنؤ کے معرکوں میں انگریزوں کا ساتھ دیا۔ مجاہدین سے مقابلے کئے اور ان خدمات کے صلہ میں چند دیہات انعام میں پائے[1]۔ منشی سید مظفر علی خاں اسیر کے شاگرد تھے۔[2]

[1] بہارستان اودھ ص۱۲۸۔ [2] گلدستۂ سخن ص۱۱۲۔

عمر کے آخری حصے میں شعر و شاعری کا شوق پیدا ہوا، مذاق سخن اچھا ہے اور کافی اچھے شعر کہتے ہیں۔ رسہ

جوانی کا جوبن جو ڈھل جائے گا ـ حسینوں کا نقشہ بدل جائے گا
مریض آپ کا رو بصحت تو ہے ـ سنبھلتے سنبھلتے سنبھل جائے گا

تجھ کو قرار کیوں نہیں اے آسماں کبھی ـ کیا دیکھ لی ہے گردش چشم بتاں کبھی
ظلم و ستم ہیں اہل زمیں پر ہزار ہا ـ آتا ہے رحم تجھ کو بھی اے آسماں کبھی

ہجر میں کیا کیا نہ پیش آیا مجھے ـ موت نے آ آ کے دھمکایا مجھے
دیکھ کر اس کو میں ایسا کھو گیا ـ دل نے بھی ڈھونڈا نہ پھر پایا مجھے

عمر بھر مجھ کو جو شغل مے سرجوش رہا ـ قبر پر مجمع رنداں قدح نوش رہا
ایک اپنی نہ کہی میں نے زمانہ کی سنی ـ مثل گل باغ جہاں میں ہمہ تن گوش رہا

شہرے عالم میں جو حضور کے ہیں ـ مجتمع لوگ دور دور کے ہیں
اچھے ہیں یا برے، خدا جانے ـ جیسے ہیں بندے ہم حضور کے ہیں

ہے کوئی حسین جس کی خبر ہم نہیں رکھتے ـ کس بزم میں، کس گھر میں گذر ہم نہیں رکھتے
تشریف وہ لائیں گے تو کیا نذر کریں گے ـ دل ہم نہیں رکھتے جگر ہم نہیں رکھتے

دل ہے خود مردہ تری بیداد کی حاجت نہیں
کشتۂ سیماب کو جلاد کی حاجت نہیں

گل ہمارے داغ ہیں، شمشاد اپنا نالہ ہے
کچھ ہمیں سیر گل و شمشاد کی حاجت نہیں

شب وصل کم اس قدر رہ گئی ـ پلک مارتے بس سحر ہو گئی

رہا فکرِ صندل پئے دردِ سر
وہ باعثِ دردِ سر ہو گئی

چمن میں لیے جو اس گل کی بو صبا آئی
دہن سے غنچوں کے آوازِ مرحبا آئی

دل دامِ زلف میں جو پھنسا تھا پھنسا رہا
عاشق تمام عمر اسیرِ بلا رہا

دل پر شبِ وصال بھی صدمہ بڑا رہا
صبحِ سیاہ بخت کا کھٹکا لگا رہا

کیا جانے کس کی لگی بد دعا مجھے
میں عمر بھر کہیں نہ کہیں مبتلا رہا

ہے مرے حال سے آگاہ مقرر گیسو
وجہ یہ ہے کہ پریشاں ہے سراسر گیسو

موتیوں سے جو گندھا کرتا ہے اکثر گیسو
ہے کوئی شاخِ ثمر دار مقرر گیسو

مشک نافوں سے بھی خوشبو میں ہیں بڑھ کر گیسو
بزم کی بزم کو کرتے ہیں معطر گیسو

مجھ سیاہ بخت کے شاید ہیں مقدر گیسو
کہ بگڑ جاتے ہیں ہر مرتبہ بن کر گیسو

رخ پہ آئے تو ہوئی شام ہٹے صبح ہوئی
رات دن چرخِ صفت کھاتے ہیں چکر گیسو

مجھ سا آشفتہ جہاں میں نہ ملے گا کوئی
ڈھونڈیں تو شمعِ رخسار کو لیکر گیسو

دھوپ اور چھاؤں کا ہے ساتھ تماشہ ہے عجب
رہتے ہیں کیسے قریبِ رخِ انور گیسو

خوب سمجھا ہوں مرے سر پہ بلا لائیں گے
پہنچے ہیں پاؤں تلک یار کے بڑھ کر گیسو

صاف لہرانے سے ظاہر ہے کہ ہیں مارِ سیہ
ایک دن مجھ کو ڈسیں گے یہ مقدر گیسو

زہر رکھتے ہیں وہی پیچ وہی، لہر وہی
مرے نزدیک ہیں افعی کے برابر گیسو

ایک چشمے میں نظر آ گئے دو سانپ مجھے
دیکھے ترے عرق آلود جو رخ پر گیسو

عطر بالوں میں لگانے کی تجھے کیا حاجت
مشک و عنبر سے بھی خوشبو میں ہیں بڑھ کر گیسو

حسن محبوب ہے صیاد، یہ صیاد کا دام　　طائرِ دل کو کرے قید نہ کیونکر گیسو

ہُو بہ ہُو حال مرا اس سے کہیں گے اک دن　　نہیں رکھنے کے لگی بال برابر گیسو

سب یہ سمجھے کہ یہ ابر سے موتی برسے　　اس قمر وش نے نچوڑے جو نہا کر گیسو

سنبلستاں سے ذرا کم نہیں میری یہ غزل
واسطیؔ میں نے جو باندھے ہیں سراسر گیسو

••

ہادی

رائے پردومن کشن مراد آبادی

رائے صاحب مراد آباد کے رئیس و تعلقدار اضلاع مراد آباد و بدایوں تھے۔ ان کے مورث اعلیٰ کو محمد شاہ بادشاہ نے "رائے" کا خطاب عطا کیا تھا اور بڑے بڑے مراتب جلیلہ پر ممتاز ہوئے تھے۔ اسی وقت شہر مراد آباد کی بنا قائم ہوئی۔

جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں رائے پردومن کشن انگریزوں کی وفاداری میں ایسے پیش پیش تھے اور ثابت قدم رہے کہ بیان سے باہر ہے۔ جب مراد آباد میں آتش بغاوت بھیلی اور مجو خاں کی نوابی کا اعلان ہوا تو رائے صاحب نے گورنمنٹ برطانیہ کی بہی خواہی میں کسی قسم کی لغزش نہیں آنے دی۔ بقول ایڈیٹر صاحب دبدبۂ سکندری رامپور۔

"اگرچہ رائے صاحب کو گروہ مفسدین نے طرح طرح کی

تکلیفیں پہنچائیں، گھوڑے اور ہاتھی اور دیگر اسباب امارت پر دست تطاول دراز کیا، مگر یہاں تو اس شعر پر عمل درآمد کیا۔ ؎

من نہ آنم کہ سر از خط وفا بر دارم
گرچہ سازند جدا چوں قلمم بند از بند"

رائے صاحب اور مجاہدین کی مڈبھیڑ کا ذکر صاحب اخبار الصادید نے بھی کیا ہے لیکن ان کے کہنے کے مطابق روپے نہ لے جانے پر سمجھوتہ ہو گیا اور دبدبۂ سکندری میں ہے کہ انہیں خوب لوٹا گیا۔ اخبار الصادید کی عبارت یہ ہے۔

"آخر کار رعایا نے مجوخاں کو اپنا حاکم قبول کیا مگر مجوخاں کو اپنے عملے کے لوگوں کے واسطے خرچ کی ضرورت پڑی تو انہوں نے مستاپور کے ایک مہاجن پر دومن کشن کو بلا کر روپیہ طلب کیا۔ اس نے روپیہ دینے سے انکار کیا۔ اس پر ایوب خاں اور حافظ علی احمد سرغنہ لوگ مسلمانوں کی جماعت کے ساتھ مہاجن مذکور کا گھر لوٹنے کو چڑھ گئے۔ اس خبر کو سنکر کنگھر کے ٹھاکر ان کی مدد کو آ گئے۔ آخر کار روپیہ نہ لے جانے پر مصالحت ہو گئی۔"

جب مجاہدین و محبان وطن حضرات کی قوت کو توڑنے کے لئے انگریزوں نے نواب محمد یوسف علی خاں والئ رامپور کو مقرر کیا تو نواب صاحب نے انتظامی معاملات میں رائے صاحب کی رائے کو فوقیت دی۔

راجے پردومن کشن نے ایک معرکہ میں مجاہدین کے مقابلہ میں بہادری کے وہ جوہر دکھائے کہ باید و شاید۔ ان سے آپ نے ایک میگزین معہ توپ کے چھین لیا اور ایک آدمی اور دو گھوڑے زخمی کئے اور جو انگریز روہیل کھنڈ کے علاقہ سے بھاگ کر نینی تال چلے گئے تھے اور پناہ گزیں ہوئے تھے ان کو راجے صاحب نے ایک بڑی رقم بھجوائی تھی۔ راجے صاحب نے اپنی کوششوں اور جانفشانیوں سے بڑی ناموری پیدا کی اور وفاداری کی سندیں ایسٹ انڈیا کمپنی سے حاصل کیں۔ چنانچہ جو سند ۲۰ جنوری ۱۸۶۰ء کو گورنمنٹ ممالک مغربی و شمالی سے راجے صاحب کے نام بحوالہ رپورٹ کمشنر روہیل کھنڈ مرقومہ ۶ دسمبر ۱۸۵۹ء نمبر ۳۴۹ صادر ہوئی اس میں ان کو ممتاز کلمات سے یاد کیا ہے اور جو بہادری و شجاعت جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں انہوں نے انگریزوں کی حمایت میں دکھائی تھی اس کی تعریف کی ہے اور ان خدمات کے صلہ میں ایک جاگیر قیمتی تین ہزار روپیہ انہیں عطا ہوئی۔ [1]

راجے صاحب کو شعر و شاعری سے بھی شوق تھا۔ ہادی تخلص تھا۔ ۱۸۵۷ء میں لالہ مکندی لال مرادآبادی نے اپنی ایک یادداشت میں سے ان کی ایک غزل نقل کر کے مجھ کو عنایت کی۔ ؎

جہاں میں شہرہ ہے جب بت کی بیوفائی کا غضب ہے اس سے ارادہ ہے آشنائی کا

شبِ وصال بھی کھٹکا رہا جدائی کا ہمارے دل کا نہ نکلا کوئی بھی ارمان ہائے

[1] دبدبۂ سکندری رامپور ۳ مارچ ۱۸۷۹ء۔

مقابل ان سے ہوں نیرنگِ چرخ کیا ممکن
ہے خاتمہ تری آنکھوں میں فتنہ زائی کا

نگاہِ شوخ سے ہو جائے گا جہاں برباد
رہا جو طور یہی اس کی کج ادائی کا

لگا کے آگ جلا دے جو چرخِ ظالم کو
تو معتقد ہوں میں اس آہ کی رسائی کا

وہاں رقیب ہیں دلشاد اُن کے وصل سے آہ
یہاں رلاتا ہے ہم کو الم جدائی کا

اٹھے ہیں کعبہ سے انجام دیکھئے کیا ہو
ہوا ہے قصدِ در بت پہ جبہہ سائی کا

غضب ہوا وہ لگاتے ہیں مہندی ہاتھوں میں
اب ان کی تیغ سے خوں ہو گا اک خدائی کا

یہ ہم نہ کہتے تھے ہادیؔ نہ دل لگاؤ کہیں
نتیجہ دیکھ لیا تم نے آشنائی کا

••

ہوسؔ

مرزا محمد تقی، فیض آبادی!

نواب مرزا محمد تقی ہوسؔ کے والد ماجد نواب مرزا علی خاں اور دادا نواب سالار جنگ تھے۔ یہ فیض آباد کے رہنے والے تھے لکھنؤ میں آکر مقیم ہو گئے تھے اور یہیں سکونت اختیار کر لی تھی۔

لکھنؤ کی جنگ آزادی ۱۸۵۷ء جب شروع ہوئی تو ان ایام میں مرزا تقی لکھنؤ میں تھے۔ جنگ آزادی کے دوران ان کا طریقہ یہ تھا کہ برجیس قدر اور حضرت محل سے بھی ملے ہوئے تھے اور انگریزوں سے روپیہ لے کر اپنے مکان میں ان کو پناہ بھی دے رہے تھے۔

۲۵ ذی الحجہ ۱۲۷۳ھ دوشنبہ کو علی رضا کو توال نے کچھ رشوت لیکر جوزف شارٹ بھائی سلطانی بیگم[1]، جوزف جوہانس اور ان کے داماد کے

سلہ سلطانی مریم بیگم بغداد کی رہنے والی تھیں ارمنی قوم سے (باقی صفحہ ۱۷۰ پر)

ساتھ تقریباً پندرہ مرد اور عورتوں کو قید سے چھوڑ دیا۔ یہ لوگ حسن علی تھانیدار
کے مکان میں جا کر رہے۔ راٹن صاحب بھی اس مکان میں پوشیدہ تھے۔
وہاں سے ان کو مرزا محمد تقی خان طمع و لالچ کی خاطر اپنے مکان منصور نگر میں
لے آئے اور ان سے مکان میں رکھنے کے روپے لینے لگے۔ یہ لوگ
مفلس ہو گئے تھے اور زیور و اسباب بیچکر گذر اوقات کرتے تھے
اس حالت میں مرزا محمد تقی کے صاحبزادے مرزا محمد عسکری نے جوزف شارٹ

(بقیہ حاشیہ ص۱۶۹) ان کا تعلق تھا عیسائی تھیں ڈاکٹر سارٹ بالیوز کی
صاحبزادی تھیں۔ واجد علی شاہ کے جلوس مسند نشینی کے تیسرے سال
کے بعد ان کی والدہ ان کو کان پور سے لکھنؤ لے آئیں اور انہوں نے
حیدرآباد دریا کے پار ایک کرایہ کے مکان میں رہائش اختیار کی۔
سال بھر تک ان کا طریقہ یہ رہا کہ انگریزی لباس پہن کر سڑک
پر کھڑی ہو جاتی تھیں جب واجد علی شاہ کا ان کے پاس سے گذر ہوتا
تو یہ ان کو سلام کر لیتی تھیں۔
واجد علی شاہ نے ایک رات اپنے قابل اعتماد میر کلو خواص کو ان
کے پاس بھیجا۔ یہ ان کے ہمراہ چلی آئیں۔ تین لاکھ کے زیورات واجد علی
شاہ نے ان کے پاس بھجوائے اور حکم دیا ان کو پہنکر ہمارے پاس
آؤ۔ حاضری ہوئی کچھ دنوں کے بعد مسلمان ہو گئیں تو بیگموں میں داخل
ہو گئیں۔ پانچہزار روپیہ ماہانہ اخراجات کا مقرر ہوا۔ اہتمام (باقی ص۱۷۱پر)

کچھ مانگا۔ جب انہوں نے کچھ نہیں دیا تو اس نے یوسف علی خاں سے جاکر کہا کہ ہمارے محلہ اور فلاں مکان میں انگریز ٹھہرے ہوئے ہیں۔ یوسف علی خاں نے عموجان سے آکر کہا۔ فوراً ان کی پلٹن کے تلنگے اٹھے اور یوسف علی خاں کے ساتھ مرزا محمد تقی کے مکان پر پہنچ گئے۔ مرزا تقی بھی اس وقت موجود تھے۔ تلنگوں نے ان سب کو گرفتار کیا اور مشکیں باندھ کر سڑکوں پر پھراتے ہوئے حضرت محل کے درِ دولت پر لائے۔ اس کے سامنے پیش کیا۔ تلنگوں نے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۷۰) ڈیوڑھی کے لئے ظفر الدولہ کپتان فتح علی خاں مامور ہوئے۔

مریم بیگم دو برس تک کھانسی اور تپدق کے امراض میں مبتلا رہیں۔ انتقال سے قبل ایک وصیت نامہ لکھا جس میں تحریر کیا۔

"میں عیسائی ہوں میری والدہ نے دولت کے لالچ میں مجھ کو مسلمان بنوادیا تھا۔ بادشاہ نے مجھ کو اپنے مذہب میں داخل کرنے کی بیحد کوشش کی لیکن مجھ کو یہ مذہب پسند نہیں آیا۔ میری تجہیز و تکفین عیسائی مذہب کے مطابق کی جائے۔"

مریم بیگم کا رات کو نو بجے ۷ر جولائی ۱۸۴۹ء میں انتقال ہوا۔ وصیت کے مطابق ٹیلہ شاہ پیر خلیل کے قریب رومن کیتھلک کے قبرستان میں دفن ہوئیں۔ ان کا متروکہ جوزف شارٹ کو ملا۔ (قیصر التواریخ صفحہ ۵۵،۵۴)

یہ تھی حقیقت جوزف شارٹ کے مسلمان ہونے کی۔

•

ان کو گولی سے اڑانا چاہا کہ اتنے میں انگریز کے پٹھو مفتاح الدولہ آڑے آگئے اور حضرت محل سے انہوں نے کہا کہ جوزف شارٹ سلطان مریم بیگم محل واجد علی شاہ کے بھائی ہیں۔ حاکم وقت کسی حاکم کو قتل نہیں کرتا بلکہ ان کی ناموس وآبرو کی حفاظت کرتا ہے اور یہ بات تو سارا شہر جانتا ہے کہ یہ مسلمان ہیں اور مسلمانی لباس پہنتے ہیں۔ مفتاح الدولہ ان کی اہلیہ کا ہاتھ پکڑ کر حضرت محل کے سامنے لے گئے کہ ملاحظہ فرمائیے کہ ان کا لباس ہندوستانیوں جیسا ہے کہ نہیں۔ ان باتوں میں حضرت محل آگئیں اور انہوں نے ان لوگوں کو جن میں مرزا محمد تقی بھی تھے چھوڑ دیا۔

یہ حضرت ایسے شاطر تھے کہ ایک طرف یہ حرکتیں کرتے تھے اور دوسری جانب جنگی عہدہ کے امیدوار بن کر برجیس قدر وغیرہ کے پاس جاتے تھے خوشامدانہ طور پر ایک روز برجیس قدر کے گلے میں نذر کے ساتھ فتح کا تعویذ بھی ڈالا۔ ایک دن چھوٹی تلوار نذر میں دی اور ان کی شان میں قصیدہ کہا اور ایک مرتبہ یہ بھی فرمانے لگے کہ میرے پاس کوئی بندوق نہیں ہے ورنہ میں کسی مورچہ پر جاتا۔ غرض اس طرح یہ اپنا الو سیدھا کیا کرتے تھے۔[1]

جناب ہوس مصحفی کے شاگرد تھے۔ صاحب سراپا سخن نے لکھا ہے کہ ان کی ہر غزل میں لیلیٰ مجنوں کا ذکر ہوتا ہے، یہ غلط ہے بلکہ صحیح یہ کہ اکثر ان کی غزلوں میں لیلیٰ مجنوں کا ذکر آتا ہے۔ بحر متقارب اور بحر متدارک شانزدہ رکنی میں ان کے اشعار پرلطف ہوتے ہیں۔ ایک مثنوی لیلیٰ مجنوں ان کی مشہور

[1] قیصر التواریخ دوئم ص ۲۴۶۔

ہے اور یہ صاحبِ دیوان بھی ہیں۔ [1]

نزع میں ہم نے عجب طرح سے دلشاد کیا — آئی ہچکی تو کہا اس نے ہمیں یاد کیا

دی دردِ عشق نے مجھے غم میں بھی اک خوشی — رونے پہ میرے دیر تک وہ ہنسا کیا

غلطی باہم جو جدائی میں کبھی ہوتی تھی — مطلبِ اظہار کہانی میں کبھی ہوتی تھی

کیا کیا نہ رنج ہم پہ ترے بن گذر گئے — اب جلد آ کہیں کہ بہت دن گذر گئے

رنجش کا انہوں نے بھی کیا وقت نکالا ہے — مجھ سے وہ بگڑتے ہیں جب خوب سنورتے ہیں

کہتا ہے دیکھ کوچے میں مجھ کو وہ سنگدل — دیوانے سے کرے کوئی کیا پھر اختلاط

بالیں پہ دمِ نزع وہ خود کام نہ آیا — مرنا بھی مرا ہائے مرے کام نہ آیا

بلبل نے کڑھایا نہ غمِ گل نے رلایا — مجھ کو تو فقط اس کے تغافل نے رلایا

محفل میں ساتھ لے نہ گیا کیوں نشانِ یار — سینے سے میں نکال کے پیکاں خجل ہوا

کر کچھ شکل ایسی جس میں راہِ عشق طے ہووے
ہوس گر لاکھ فن کے تم ہوئے استاد کیا حاصل

مجنوں سے ہوس ہو دیں گے ہم جا کے مقابل — تھوڑی سی توانائی بھی ہم کو اگر آئی

دردِ دل سے تو کسی کو ہوس آگاہ نہ کر
شرط الفت تو یہ ہے جان دے اور آہ نہ کر

کبھی دیر میں تھے کسی بت پہ فدا، کبھی کعبہ میں کرتے تھے جا کے دعا
ترے در پہ جو بیٹھے تو خوب ہوا کہ کشاکشِ دیر و حرم سے چھٹے

[1] سخن الشعرا ص ۵۶۴۔

یہی کہتی تھی لیلیٰؔ پردہ نشیں کہ فراق کی اب اسے تاب نہیں
ملوں اس سے کہ نامِ قیس حزیں، غمِ ہجر کے درد و الم سے چھٹے
ہوئے عازمِ ملکِ عدم جو حسیں، تو خوشی یہ ہوئی تھی کہ غم سے چھٹے
پہ فراغِ الم سے وہاں بھی نہ تھا وہ غم یہ ہوا کہ وہ ہم سے چھٹے